اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

دسمبر ۲۰۲۵ء

البرہان

لاہور

یونیورسٹیوں کو اپنا کردار بدلنے کی ضرورت ہے

مُدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 Monthly Al Burhan December 2025

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبرشمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۴	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۲	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۳	خاموش انقلاب بذریعہ تعلیم وتربیت	۲۸۸
۶	یکساں قومی نصاب۔خدشات ومضمرات	۲۰۸
۵	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
۷	اسلامی علوم میں تحقیق۔اصول، ترجیحات اور معیار	۲۷۲
۸	ماڈل نظامِ تربیت برائے سکولز (پروفیسر ارشد جاوید)	۸۸
۹	مقالاتِ تعلیم (پروفیسر ملک محمد حسینؒ)	۵۷۶
	فہم قرآن برائے سکولز، کالجز، یونیورسٹیز	
۱۰	تدریس القرآن پارہ:۱، ۲ برائے معلمین	--
۱۱	تدریس القرآن جلد اوّل (الفاتحہ۔النساء)	--
۱۲	تدریس القرآن جلد دوم (المائدۃ۔التوبہ)	--
۱۳	تدریس القرآن جلد سوم: (یونس۔الکہف)	--
۱۴	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۱۵	تعلیمی ادارے اور کردار سازی ای بُک	۱۷۲
۱۶	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۷	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۸	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۹	مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ وتجزیہ ای بُک	۱۵۶
۲۰	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۲۱	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۲۲	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴

نمبرشمار	کتاب	صفحات
۲۳	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تعمیرِ سیرت (تزکیۂ نفس)	
۲۴	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
۲۵	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً) ای بُک	۶۲
۲۶	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۷	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۸	عصر حاضر میں اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۴
	اسلام اور مغربی فکر وتہذیب	
۲۹	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۳۰	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۳۱	اسلام اور ردِّ فکرِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۳۲	عروجِ اُمتِ مسلمہ (مسلم نشأۃ ثانیہ)	۳۸۴
۳۳	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۳۴	رزم حق وباطل ای بُک	۸۰
۳۵	اسلام اور پاکستان ای بُک	۳۰۰
۳۶	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون ای بُک	۲۵۰
۳۷	جہاد اور دہشت گردی۔عصری تطبیقات ای بُک	۱۳۰
۳۸	مقالاتِ امین (جلد اوّل) ای بُک	۶۷۶
۳۹	مقالاتِ امین (جلد دوم) ای بُک	۶۴۲
	اللغة العربية	
۴۰	السلطة التشريعية_دراسة مقارنة ای بُک	۱۵۰
	English Books	
۴۱	Islamization of Laws in Pakistan	250
۴۲	Riyaz us Saliheen I & II	950
۴۳	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان
127 علی ٹاؤن، ٹھوکر نیاز بیگ، رائے ونڈ روڈ لاہور
0336-1913636

یہ اسباق یوٹیوب پر بھی موجود ہیں:
Prof.Dr. Muhammad Amin

تدریس القرآن

مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

سبق: ٢٠ — سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ مَدَنِیَّۃٌ — آیات ١٠٤ـ١٠٧

اٰیاتُھا ٢٨٦ — رُکُوْعَاتُھا ٤٠

متن قرآن حکیم مع ترجمہ لفظی و بامحاورہ	قرآنی لفظ	اردو استعمال
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ / اٰمَنُوْا / لَا تَقُوْلُوْا / رَاعِنَا / وَ قُوْلُوا	تَقُوْلُوْا	قیل وقال، قول واقرار
اے وہ لوگو جو / ایمان لائے ہو / تم نہ کہو / راعنا / اور تم کہو	رَاعِنَا	رعایت کرنا، رعایتی قیمت*
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم راعنا نہ کہا کرو بلکہ	اٰمَنُوْا	ایمان، مؤمن، مؤمنات
انْظُرْنَا / وَاسْمَعُوْا ط / وَ لِلْكٰفِرِيْنَ / عَذَابٌ / اَلِيْمٌ ﴿104﴾	انْظُرْنَا	نظر، نظارہ، منظر*
انظرنا / اور تم غور سے سنو / اور کافروں کے لیے / عذاب ہے / دردناک	عَذَابٌ	تعذیب، عذاب جہنم
انظرنا کہا کرو اور دھیان سے سنا کرو جب کہ کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔	اَلِيْمٌ	درد و الم، المناک
مَا يَوَدُّ / الَّذِيْنَ / كَفَرُوْا / مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ / وَلَا	يَوَدُّ	مودت، ودود (اللہ کا نام)
وہ نہیں چاہتے / جن لوگوں نے / انکار کیا / اہل کتاب میں سے / اور نہ	كَفَرُوْا	کفر، کافر، کفار، تکفیر
مشرکین اور اہل کتاب میں سے جو لوگ اسلام کا انکار کر رہے ہیں	اَهْلِ	اہل و عیال، اہل کتاب
الْمُشْرِكِيْنَ / اَنْ يُّنَزَّلَ / عَلَيْكُمْ / مِّنْ خَيْرٍ / مِّنْ رَّبِّكُمْ ط	يُنَزَّلَ	نازل، نزلہ، نزول
مشرکین / کہ اتاری جائے / تم پر / بھلائی / تمہارے رب کی طرف سے	الْمُشْرِكِيْنَ	شرک، شرکاء، مشرک
نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو	خَيْرٍ	خیر خیریت، جزائے خیر
وَاللّٰهُ / يَخْتَصُّ / بِرَحْمَتِهٖ / مَنْ / يَّشَآءُ ط / وَاللّٰهُ	يَخْتَصُّ	اختصاص، تخصیص، خصوصی
حالانکہ اللہ / خاص کرتا ہے / اپنی رحمت کو / جس کے لیے / وہ چاہتا ہے / اور اللہ	يَّشَآءُ	ان شاء اللہ، ماشاء اللہ
حالانکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرلیتا ہے اور اللہ	بِرَحْمَتِهٖ	رحم، رحمت، رحیم
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿105﴾ / مَا / نَنْسَخْ / مِنْ اٰيَةٍ / اَوْ نُنْسِهَا	الْعَظِيْمِ	عظمت، اعظم، معظم
بڑے فضل والا ہے / جو / ہم منسوخ کرتے ہیں / کوئی آیت / یا ہم اسے بھلوا دیتے ہیں	نَنْسَخْ	نسخ، ناسخ، منسوخ
بڑے فضل والا ہے۔ ہم جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں یا (تمہیں) اس کو بھلوا دیتے ہیں	نُنْسِهَا	نسیان، نسیاً منسیا
نَاْتِ / بِخَيْرٍ / مِّنْهَآ / اَوْ مِثْلِهَا ط / اَلَمْ / تَعْلَمْ / اَنَّ	بِخَيْرٍ	خیر خیریت، جزائے خیر
ہم لاتے ہیں / بہتر / اس سے / یا اس جیسی / کیا نہیں / تم جانتے / کہ	تَعْلَمْ	علم، علماء، علامہ، تعلیم
ہیں، ہم اس کی جگہ اُس جیسی یا اس سے بھی بہتر آیت لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے	مِثْلِهَا	مثال، مثالیں، امثلہ

متن قرآن حکیم مع ترجمہ لفظی وبامحاورہ							قرآنی لفظ	اردو استعمال
اللّٰهَ	عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ	قَدِیْرٌ (106)	اَلَمْ	تَعْلَمْ	اَنَّ	اللّٰهَ	قَدِیْرٌ	قادر، قدرت، مقدرت
اللہ	ہر چیز پر	قدرت رکھتا ہے	کیا نہیں	تم جانتے	کہ	اللہ	تَعْلَمْ	علم، علوم، عالم، علماء
کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی							شَیْءٍ	شے، اشیاء ضروریہ
لَهٗ	مُلْكُ	السَّمٰوٰتِ	وَالْاَرْضِ ؕ	وَمَا	لَكُمْ		مُلْكُ	مملکت، ملوکیت
اس کے لیے	بادشاہی	آسمانوں کی	اور زمین کی	اور نہیں	تمہارے لیے		السَّمٰوٰتِ	ارض وسماء، کتب سماویہ
کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی							الْاَرْضِ	قطعہ اراضی، ارضی، ارض
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	مِنْ	وَّلِیٍّ	وَّلَا	نَصِیْرٍ (107)			وَّلِیٍّ	ولی، اولیاء، ولایت، مولیٰ
اللہ کے سوا	کوئی	دوست	اور نہ	مددگار			نَصِیْرٍ	نصرت، منصور، انصار، ناصر
اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔							مِنْ	منجانب، من حیث القوم

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

۱۔ رَاعِنَا: کالفظی ترجمہ ہے ''آپ ہماری رعایت کیجئے'' اور ''اُنْظُرْنَا'' کالفظی ترجمہ ہے ''آپ ہماری طرف دیکھیے''۔ عربی زبان میں یہ جملے اس وقت بولے جاتے ہیں جب کسی کہنے والے کی بات سمجھ میں نہ آئے یا آدمی اس کی بات دھیان سے نہ سن سکے اور اس سے شائستگی سے بات دہرانے کی درخواست کرے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ ''جی آپ نے کیا فرمایا؟''، ''جی! میں سمجھا نہیں'' اور انگریزی میں کہتے ہیں ''I beg your pardon''۔

۲۔ وَلِیٌّ: ولی کا عربی میں مفہوم ہے دوست، ساتھی، مددگار، سرپرست۔

مفہوم کا خلاصہ

۱۔ یہودیوں کی کم ظرفی اور سازشوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ رَاعِنَا کہتے ہوئے زبان کی لوچ سے اسے رَاعِیْنَا بنا دیتے جس کا مطلب ہے، ''ہمارا چرواہا''، لہٰذا اللہ نے مومنوں سے کہا کہ تم یہ لفظ ہی استعمال نہ کرو جس میں آپ ﷺ کی بے ادبی کا پہلو نکل سکتا ہے بلکہ اگر ضرورت ہو تو اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ اور دھیان سے آنحضرت ﷺ کی بات سنا کرو کہ اُنْظُرْنَا کہنے اور بات کو دہرانے کی درخواست کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

حاصل کردہ سبق

۱۔ ذومعنی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کھری اور صاف بات کرنی چاہیے۔ ۲۔ کسی کو نعمت ملے تو اس پر حسد نہیں کرنا چاہیے۔

۳۔ جنابِ نبی کریم ﷺ سے محبت کرو اور ان کا ادب کرو۔ ان کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کی سزا دنیا میں بھی سخت ہے یعنی قتل اور آخرت میں تو جہنم کا دردناک عذاب ہے۔

۴۔ زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے، سب کا واحد خالق و مالک اللہ ہے لہٰذا اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور اسی کا سہارا طلب کرنا چاہیے۔

ماہنامہ
البرہان
لاہور
Since 2010
جلد ۲۹
شمارہ ۱۲
برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk
دسمبر ۲۰۲۵ء/ جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ

آئینہ مضامین

☜ فکرونظر — ہمارا سب سے بڑا مسئلہ — ۴
☜ شذرات — غزہ - جسے ہم بھول رہے ہیں - لاوا پھٹنے والا ہے — ۸
☜ تعلیم وتربیت
- 'تدریس القرآن' از ڈاکٹر ایس ایم زمان — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۱۰
- ہر طالب علم کا سوال — ڈاکٹر رسول بخش رئیس — ۱۴
- یونیورسٹیوں کو اپنا کردار بدلنے کی ضرورت — وقاص ریاض — ۱۷
- مصنوعی ذہانت کا انقلاب — محمد علی — ۱۹
☜ پاکستانیات
- پاکستانی ارکانِ پارلیمنٹ کے نام کھلا خط — انجینئر گلبدین حکمت یار — ۲۲
- 'بدل دو نظام' - آئیڈیا اچھا ہے مگر..... — مدیر — ۳۰
- ۲۷ ویں ترمیم کی اصل حقیقت — جاوید انور — ۳۵
- لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے — خالد مسعود خان — ۳۸
☜ اسلام اور مغرب
ملوکیت بھری جمہوریت کا زوال — حافظ عمران طحاوی — ۴۱
☜ غامدیت
- تجدد خلافِ اسلام ہے — مفتی منیب الرحمٰن — ۴۷
سرسید سے لے کر غامدی تک تحریک تجدد کا ایک تنقیدی مطالعہ
- جماعت اسلامی کی فکر اور جاوید غامدی — مدیر — ۵۸
- علم النبیؐ: احادیث پر غامدی صاحب کی باریک واردات — محمد مدثر علی راؤ — ۶۲
☜ تفہیم اسلام
- حصولِ غلبہ واقتدار اور بعثتِ انبیاء کا مقصد — ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ۶۸
ڈاکٹر عثمان احمد صاحب سے مکالمہ
- فلسفۂ غزالی اور ناقدین کی حقیقت — مولانا عبداللہ عمر — ۷۶
☜ تبصرۂ کتب
اسلامی بینکاری: غیر سودی یا سودی اور استحصالی — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۷۹
English Section — ۸۲
Confessions of British Premier
Europe Unfolds its hate for Islam and its Prophet

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکرونظر

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ

ہمیں اور ہمارے معاشرے کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے لیکن ہمارے نزدیک ام الامراض اور سارے مسائل کی جڑ یہ مسئلہ ہے کہ ہم اچھے مسلمان نہیں، ہم اچھے مسلمان بننا بھی نہیں چاہتے اور ہمیں اچھا مسلمان بنانے والا کوئی ہے بھی نہیں!

ہم یہ بات پہلے بھی کہتے رہتے ہیں لیکن آج برادر اظہار الحق نے اپنی تلخ نوائی میں 'ہم اور اسلام کا اصل چہرہ' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے اس احساس کو زیادہ اچھے انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ پڑھیے اور پھر اس پر ہمارا مختصر تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

''ہم پوری دنیا کو اسلام کا اصل چہرہ دکھانا چاہتے ہیں۔ ہمیں قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگیوں کو اس طرح ڈھالنا ہے کہ ہم دنیا کو اسلام کا صحیح چہرہ دکھانے کے لیے خود کو اس قابل بنا سکیں کہ ہم زبان سے دعوت دینے کی بجائے انہیں اپنے کردار سے دعوت دے سکیں''۔

یہ قابلِ تحسین بیان ہمارے مذہبی امور کے وفاقی وزیر صاحب کا ہے۔ ماشاءاللہ! بہت خوش آئند عزم ہے۔ ہر اچھے مسلمان کی یہی خواہش ہے، ہم بھر پور تائید کرتے ہیں۔ تائید سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہم اس نیک کام میں ان کی معاونت کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ جب دنیا کو اسلام کا اصل چہرہ دکھائیں تو رائیونڈ کے محلات ضرور دکھائیے گا اور مختلف شہروں میں بنے ہوئے زرداری ہاؤس بھی۔ ایک جھلک لندن کے فلیٹوں کی بھی۔ اور ابھی آپ نے بڑی شخصیات کو جو عدالتی استثنا دیا ہے' اس سے بھی ضرور دنیا کو آگاہ کیجیے گا۔ اور اگر دنیا کہے کہ خلفائے راشدین حکمران ہوتے ہوئے بھی عدالتوں میں پیش ہوتے رہے' تو بحث میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دنیا کو کیا معلوم کہ آج کیا درست ہے اور کیا نادرست! ان بابوں کو بھی ضرور دکھائیے گا جو ملک کے اطراف واکناف میں تشریف فرما ہیں۔ اور خلقِ خدا کی حاجات چٹکیوں میں پوری کرتے ہیں۔ کچھ مریدوں میں کرنٹ چھوڑتے ہیں۔ کچھ تھا پڑے

مارتے ہیں۔ کچھ اولاد دیتے ہیں۔ کچھ صحت کے انچارج ہیں۔ کچھ محبوب ملوانے کے سپیشلسٹ ہیں۔ کچھ نے خلیفے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک ایک ماہ کے اخراجات ایک ایک خلیفہ کے ذمے ہیں۔ بہت کم حقیقی اور جینوئن پیر اور اللہ والے بھی ہیں۔ انہیں مت دکھایئے گا ورنہ اکثریت ان صاحبان کی ناراض ہوجائے گی۔ اسلام کا اصل چہرہ دکھاتے وقت خواتین کو فراموش نہ کیجیے گا۔ ہمارے ہاں خواتین کے ساتھ جو سلوک ہورہا ہے وہ بھی اسلام سے بہت مطابقت رکھتا ہے۔ عورت بیٹی کو جنم دے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ مار پیٹ، تشدد اور بعض اوقات طلاق کی سزا بھی ملتی ہے۔ شہر شہر گاؤں گاؤں نجی پنچایتیں، کھلے عام، متوازی نظامِ انصاف لیے بیٹھی ہیں۔ مرد جرم کا ارتکاب کرے تو سزا اس کی بہن یا بیوی کو ملتی ہے۔ دس پندرہ سال کی بچی کی ’’شادی‘‘ ساٹھ ستر سالہ بُڈھے کے ساتھ ہوجاتی ہے۔ ہماری حکومت چونکہ اسلام کے معاملے میں ازحد سنجیدہ ہے اس لیے آج تک ان نجی پنچایتوں کو خلافِ قانون قرار نہیں دیا گیا‘ نہ ہی ان معاملات میں سزا دی جاتی ہے۔

پاکستان میں جو نظامِ انصاف رائج ہے، اسے ضرور دنیا کے سامنے لایئے گا۔ یہی تو اصل چہرہ ہے۔ اس ضمن میں دو نام ضرور دنیا کو بتایئے گا۔ حاجی عطا اللہ اور مجید خان اچکزئی۔ اول الذکر ٹریفک سارجنٹ تھا اور چوک پر کھڑا ڈیوٹی دے رہا تھا۔ جناب مجید خان اچکزئی قانون ساز ادارے کے معزز رکن تھے۔ انہوں نے عطا اللہ کو اپنی گاڑی کے نیچے دے کر ہلاک کردیا۔ مگر یہ وہ بات نہیں جو دنیا کو بتائے جانے کے لائق ہے۔ آپ نے جو چہرہ دنیا کو دکھانا ہے اس میں ایم پی اے صاحب دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنا رہے تھے۔ موصوف کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ نظام انصاف کے حوالے سے ظاہر جعفر کا بھی دنیا کو بتانا چاہیے جس نے نور مقدم کو قتل کیا اور ابھی تک یہ مقدمہ چل رہا ہے۔ اُن چار نوجوانوں کا ذکر بھی ضروری ہے جو ایبٹ آباد سے روزگار کی تلاش میں اسلام آباد آئے تھے اور ایک گاڑی نے، جو ایک طاقتور خاتون کی ملکیت تھی اور جسے مبینہ طور پر ان کا صاحبزادہ چلا رہا تھا، ان چاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر غمِ روزگار سے آزاد کردیا۔ ہمارے نظامِ انصاف میں ایک اور بے مثال واقعہ بھی رونما ہوا۔ وفاقی دارالحکومت کے ایک معروف ریستوران میں کام کرنے والے دو نوجوان چھٹی کرکے رات کو گھر جارہے تھے۔ ایکسپریس وے پر ایک تیز

رفتار گاڑی نے دونوں کو مار دیا۔ ایک مقتول کے وارث تو جلد ہی ''افہام و تفہیم'' کو بروئے کار لے آئے۔ دوسرے مقتول کے بے وقوف والد نے انصاف حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ مگر جلد ہی وہ بھی راہِ راست پر آ گیا اور مقدمہ واپس لے لیا۔ یہ صرف ایک واقعہ نہیں! پاکستانی نظام انصاف میں اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ مدعی کو اچانک معلوم پڑتا ہے کہ اس نے جس کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے، وہ تو بے قصور ہے۔ چنانچہ وہ کیس واپس لے لیتا ہے۔ جنابِ والا کی خدمت میں عرض ہے کہ دنیا کو اس اسلام کا اصل چہرہ، جو پاکستان میں رائج ہے، دکھاتے وقت نظامِ انصاف کو ضرور شامل کیجیے گا۔ اب ڈمپر اور ٹریکٹر ٹرالیاں ہی دیکھ لیجیے۔ انہیں مرد عورتیں بچے بوڑھے مارنے کی کھلی چھٹی ہے۔ نہ کوئی قانون ہے نہ سزا!

ماشاءاللہ! ہمارا ملک اسلام کا قلعہ بھی کہلاتا ہے۔ مساجد و مدارس کی کثرت ہے۔ ہم نے عزم کیا ہوا ہے کہ کریملن سے لے کر وائٹ ہاؤس تک، ہر جگہ اسلام پہنچانا ہے۔ ہمارا معاشرہ اسلامی اقدار سے چھلک رہا ہے۔ گوگل کہتا ہے کہ انٹرنیٹ پر خبیث نوعیت کے مناظر دیکھنے میں ہمارا پہلا نمبر ہے۔ وعدہ خلافی میں ہمارا ایک نام اور مقام ہے۔ مذہب کو سیاست اور کاروبار کے لیے خوب خوب استعمال کرتے ہیں۔ شراب نوش بتاتے ہیں کہ اس ممنوعہ مشروب کا حصول اسلام کے اس قلعہ میں ذرا بھی مشکل نہیں مگر بظاہر پابندی ضرور لگانی ہے!! دروغ گوئی رگوں میں خون کی صورت رواں ہے۔ ہر شخص ہر جگہ، ہر وقت، ہر حال میں جھوٹ بولتا ہے۔ بچے ماں باپ سے، ماں باپ بچوں سے، میاں بیوی سے، بیوی میاں سے، آجر ملازموں سے، ملازم آجر سے، حکومت عوام سے اور عوام حکومت سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ریڑھی والوں سے لے کر حکمرانوں تک کوئی بھی سچ نہیں بولتا۔ تنخواہ سب پوری لیتے ہیں اور جائے ملازمت پر سب تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ وفاقی وزیر صاحب کو اللہ خوش رکھے۔ دنیا کو اسلام کا اصل چہرہ دکھانے سے پہلے ایک بار ایک عام پاکستانی کی طرح کچہری جا کر زمین یا جائداد کا ذرا انتقال کرا کے دیکھیں یا تھانے جا کر کسی کیس میں ایف آئی آر ہی کٹوا کر دکھائیں! کسی مکان کا نقشہ ہی منظور کرا کر دکھا دیں۔ چلیے اسلام آباد ہی میں یہ کام کرا کے دکھا دیں! اس اسلامی جمہوریہ میں ہر جگہ، ہر قدم پر ہر معاملے میں رشوت عام ہے۔ سرکاری تعمیرات (ورکس)

میں ''کمیشن'' کو شیرِ مادر سمجھا جاتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ ہو رہا ہے۔ متشرع تاجر غذا سے لے کر دوا تک ہر شے میں ملاوٹ کر رہے ہیں۔ مال بیچتے وقت نقص نہیں بتاتے۔ ٹیکس چوری کرتے ہیں۔ خریدا ہوا مال واپس کرنا تو دور کی بات ہے، تبدیل تک نہیں کرتے۔ سرکاری فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر قبضہ کیے بیٹھے ہیں۔ کوئی تاجر یا ڈاکٹر یا وکیل جرم کرے اور پکڑا جائے تو اسے بچانے کے لیے سب تاجر، سب ڈاکٹر اور سب وکلا ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اس اسلامی ملک میں دل کے مریضوں کو جعلی سٹنٹ ڈالے جاتے ہیں اور وہ بھی ضرورت کے بغیر! قصاب بر افروختہ ہیں کہ ان کا کام اور نام ڈاکٹروں نے کیوں اپنا لیا ہے۔ ہم پاکستانی جس اسلام کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر مسلم ملکوں کو قابلِ قبول نہیں! چنانچہ سعودی عرب ہو یا یو اے ای، ایران ہو یا ترکیہ، ملائشیا ہو یا انڈونیشیا، ہمیں ہزاروں کی تعداد میں ملک سے باہر نکال دیا جاتا ہے!

ہم عالم اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہیں۔ اس لیے اسلام کا اصل چہرہ دکھانے کی ذمہ داری بھی ہماری ہے۔ ہم اس معاملے میں محترم وزیر صاحب کے ساتھ ہیں۔ کچھ اور مشورے یاد آ گئے تو بعد میں پیشِ خدمت کر دیں گے!''

سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم سب، ہر مسلمان، پورا معاشرہ، کیا ہر مسلمان کو یاد نہیں کہ اس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے؟ چلیے ہم بھول گئے، ہم بے عمل اور بدعمل ہو گئے، ہماری اصلاح کون کرے گا؟ ہمارے حکمران؟ جو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے علمبردار اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمن مغرب کے غلام ہیں؟ ہمارے علماء جن کو اپنے مسلکی جھگڑوں سے فرصت نہیں، ہمارے صوفیاء جن کی اکثریت کو پتا ہی نہیں کہ تزکیۂ نفس کس چڑیا کا نام ہے؟ ہمارا میڈیا اور جدید تعلیم جو سرتا پا مغرب زدہ ہے۔ ہماری 'مذہبی تعلیم' جسے صرف اپنی مسجدوں کے لیے مولوی تیار کرنے کی فکر ہے؟ ہماری اصلاحی تبلیغی جماعتیں جو بڑے اخلاص سے لوگوں کے کلمے صحیح کراتی پھرتی ہیں؟ ہماری دینی سیاسی جماعتیں جو ''سیاسی جدوجہد'' سے اقتدار میں آ کر اسلامی انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ کوئی بتائے کہ اس گلتے سڑتے معاشرے کی اصلاح کون کرے گا؟

شذرات

غزہ - جسے ہم بھول رہے ہیں

جاگتے رہنا، سو نہ جانا

ہم غزہ کو بھول رہے ہیں؛ ہم سمجھ رہے ہیں کہ جنگ بندی ہوگئی، امن ہو گیا، بس اب خیریت ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسرائیل کے حملے جاری ہیں، شہادتیں ہو رہی ہیں، مکان تباہ ہو رہے ہیں۔ باہر سے امداد آنے پر پابندیاں ہیں۔ اسرائیل نے مغربی کنارے کو ضم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ گویا غزہ کے علاوہ باقی فلسطین بھی ہڑپ۔ ٹرمپ کی سازشیں بھی جاری ہیں جو مسلمان ملکوں کی فوجوں کے ذریعے حماس سے ہتھیار واپس لینا چاہتا ہے۔ فلسطین کی ڈمی حکومت بنانا چاہتا ہے۔ اس نے سلامتی کونسل سے اپنی جنگ بندی والی قرارداد منظور کرا کے اسرائیل کو دوبارہ دنیا کی نظروں میں بحال کرانے کا آغاز کر دیا ہے۔

ان حالات میں غزہ، حماس اور فلسطین کے حمایتیوں کے سونے کا نہیں جاگنے کا وقت ہے تاکہ فلسطین کا مسئلہ حل ہو سکے، اس میں صحیح سیدھے خطوط پر پیشرفت ہوتی نظر آئے۔ ٹرمپ غیر جانبدار نہیں، اسرائیل کا حمایتی ہے، اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ جو اس کا یار ہے وہ درحقیقت اس کا ایجنٹ ہے۔ جو ان باتوں کو نہیں سمجھتا اس کی فراست درحقیقت سفاہت ہے۔ اللہ ہمیں روزِ بد سے بچائے۔

لاوا پھٹنے والا ہے

تاحیات اقتدار کی پلاننگ کرنے والے دانشمند درحقیقت بے دانش ہیں

بڑا بے دانش ہے وہ شخص جس نے دستور پاکستان میں ستائیسویں ترمیم کا سوچا اور اسے پاس کرایا کیونکہ جس نے یہ کیا، کرایا اس نے درحقیقت انقلاب کو دعوت دی کیونکہ جب کوئی تبدیلی کے سارے راستے بند کر دیتا ہے تو اضطراری طور پر وہ کہیں نہ کہیں سے پھوٹ پڑتی ہے جیسے پریشر ککر پھٹ جاتا ہے کیونکہ گیس جب جمع ہو جائے تو اسے کہیں نہ کہیں سے نکلنا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی کی فطرت ہے، یہ اس کے روکنے کا منطقی اور سائنٹفک نتیجہ ہے، فطری ردّعمل ہے۔

دوام اور اقتدار صرف اس ذاتِ بے ہمتا کو زیب دیتا ہے، باقی سب کچھ فنا ہو جانے والا ہے ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝٢٦ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝٢٧﴾

تم سے پہلے وہ جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا
اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا

فرعون نے جب سارے راستے بند کر دیے تو خدا نے اس کے گھر موسیٰ بھجوا دیا اور خود اس کے ہاتھوں موسیٰؑ کی پرورش کرائی۔ ثبات اِک تغیر کو ہے زمانے میں۔ ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ فیلڈ مارشل ایوب خاں سے استعفیٰ جنرل یحییٰ خان نے لیا۔ جنرل ضیاء الحق کی لاش کھیتوں میں بکھر گئی۔ جنرل مشرف کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں جنرل کیانی کا ہاتھ تھا، پھر عدلیہ نے اسے سزا دی کہ اس کی میت کو قبر سے نکال کر پھانسی دی جائے....اور جنرل باجوہ بیرون ملک چھپتے پھر رہے ہیں۔ اب نئے فیلڈ مارشل صاحب کا حشر کیا ہوگا؟ اللہ جانے۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ لوگ سبق نہیں سیکھتے۔ اے لوگو! اللہ سے ڈرو، حُبّ جاہ و مال کو چھوڑ و اور ماضی سے سبق سیکھو کہ فرعون، ہامان اور قارون کا کیا حشر ہوا؟ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝٢﴾

بقیہ: ہر طالب علم کا سوال

میں اس خیال کو بالکل مسترد تو نہیں کر سکتا کہ تعلیم اور نصاب کا تعلق جدید معیشت کے تقاضوں سے منسلک ہو، مگر اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور معیشت کو صرف فنی شعبوں تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ علم کا بنیادی مقصد ہی اس شعور کی بالیدگی ہے جو ہمیں زندگی، ذات اور سماج سے آگاہی کی راہیں تنقیدی زاویہ فکر کے ساتھ استوار کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور کرے۔ کسی دور میں اکثریت کی ترجیح بھیڑ چال کی طرح جو بھی ہو، میرے نزدیک اہمیت انفرادیت اور فطری رجحان کی ہے۔

جس مسابقت کی بھٹی میں ہم اپنے بچوں کو پھینک کر انہیں اپنی کچھ بننے کی خواہش کی نذر کر دیتے ہیں، وہ ہماری ذاتی پسند کا اظہار ہوتی ہے، اس کے نتائج ہمیشہ مثبت نہیں دیکھے۔ بچے بھی انسان ہیں، ان کی تربیت ایک خودمختار انسان کے طور پر ہو تو آپ کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

'تدریس القرآن' از ڈاکٹر ایس ایم زمان

قرآنی عربی کے بنیادی قواعد کی تفہیم پر ایک منفرد کتاب

ڈاکٹر ایس ایم زمان (شیر محمد زمان چشتی) اسلامی علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، ہارورڈ سے پی ایچ ڈی اور پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی و علمی اداروں ادارہ تحقیقاتِ اسلامیہ (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ رہے۔ ریٹائرڈ لائف میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت وتندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ ہم ان سے فیض یاب ہوتے رہیں۔

قرآنی عربی سکھانے والی اس منفرد کتاب کے وجود میں آنے کا پس منظر بتاتے ہوئے مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ:

۱۹۹۳ء میں پاکستان ٹیلی ویژن سے متعدد جلدوں پر مشتمل راولپنڈی سے شائع ہونے والی ایک تفسیر قرآن پر تبصرہ نشر کیا گیا۔ راقم الحروف بھی مبصرین میں شامل تھا۔ اس تفسیر کی ضخامت کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ ہر کلمہ جہاں جہاں بھی استعمال ہوا صرفی تحلیل، اسماء وافعال اوران کے صیغوں کی تفصیل کے ساتھ لکھی گئی تھی۔ ناچیز کا خیال یہ تھا کہ بنیادی قواعد کو آغاز میں مرتب شکل میں یکجا کر دیا جائے تو ہر مقام پر اس تکرار کی حاجت نہیں رہے گی۔ شیخ احمد حسن (مرحوم) ان ایام میں پی ٹی وی کے سربراہ تھے۔ پروگرام دیکھ کر انہوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ میں ان بنیادی قواعد کو پی ٹی وی کے ناظرین وسامعین کے لیے مرتب پروگراموں کی شکل میں پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کروں۔ قرآن کی خدمت کے اس موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے ناچیز نے ان کے ارشاد کی تعمیل کا وعدہ کرلیا اور بحمد للہ تعالیٰ اِکاون اَسباق پر مشتمل یہ سلسلہ ہفتہ وار پروگراموں کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اَسباق کی تیاری میں ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ریسرچ سکالر میاں افتخار صاحب کا تعاون بھی شامل حال رہا۔ محض رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کی گئی اس خدمت کو اُسی جواد وکریم کے فضل سے غیر معمولی

مقبولت حاصل ہوئی۔

پی ٹی وی کے کئی ممتاز ناظرین اور احباب گرامی کا اصرار رہا کہ ان اسباق کو ان کی افادیت کے پیش نظر کتابی شکل میں مدوّن کیا جائے مگر کئی اسباب کی بنا پر اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا اور اس پر کئی سال گزر گئے۔

اس پروجیکٹ کے احیاء کا سہرا میرے دیرینہ رفیق مولوی محمود اختر صاحب کے سَر ہے۔ انہوں نے کسی ایماء کے بغیر یوٹیوب سے ان اسباق کو صفحات قرطاس پر منتقل کیا۔ بالاقساط وہ یہ مواد مجھے بھیجتے رہے اور میں ان کی موجودہ شکل میں تدوین کرتا رہا۔ اس کاوش میں مولوی صاحب کو متعدد پروف تیار کرنے پڑے اور یہ کام انہوں نے نہایت خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ کسی مادّی منفعت سے بالکل قطع نظر محض ثواب سمجھ کر سرانجام دیا۔ ربّ رحیم ان کو جزائے جزیل عطا فرمائے۔

اس کام کی اہمیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدۡ يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ﴾[القمر ۵۴:۳۲]

’’یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے (سمجھنے کے لیے) آسان کر دیا، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا (سوچنے والا)؟‘‘

سورۃ القمر میں اس ارشاد کا چار مرتبہ اعادہ کیا گیا ہے۔(۵۴:۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰) اس صریح اعلانِ خداوندی کے باوجود ہمارے ہاں عام طور پر یہ مفروضہ رائج ہو گیا ہے کہ عربی بڑی مشکل زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلام الٰہی سمجھنے کے لیے اتنی محنت ومشقت درکار نہیں جتنی ہم دیگر دنیوی کاموں یا انگریزی جیسی دیگر زبانیں سیکھنے کے لیے برداشت کرتے ہیں۔

آئندہ اسباق میں ہمارے مخاطب خصوصیت سے وہ پڑھے لکھے اصحاب، طلبہ وطالبات، اردوخواں بہن بھائی، بزرگ اور خواتین ہیں جنہوں نے عربی زبان کو باقاعدہ طور پر نہیں سیکھا، قرآن ناظرہ پڑھ سکتے ہیں اور سب سے ضروری بات یہ کہ اپنے دل میں قرآن کریم سیکھنے اور اس کے مطالب کو سمجھنے کے لیے ایک تڑپ اور شوق رکھتے ہیں۔ صرف اردو نہیں ہماری سب

پاکستانی زبانوں میں ہزاروں عربی الفاظ موجود ہیں جو روزمرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ ایک اضافی سہولت ہے۔ اسی لیے اس کتاب میں جابجا ایسے عربی الفاظ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو مختلف شکلوں میں اردو میں رائج ہیں۔ ان کے ربط و تعلق کی شناخت سے عربی متن کا مفہوم ذہن میں راسخ کرنے میں خاصی مدد ملے گی۔

اس کتاب کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلوب بیان سادہ سلیس اور تخاطب (ہمکلامی) کا ہے۔

۲۔ زیادہ توجہ صرفی تفاصیل کی طرف رہی ہے تاکہ مادہ (root)، اسماء وافعال کے اشتقاق اور ان کے مختلف صیغوں کو ذہن نشین کیا جا سکے۔ اس ضمن میں مختلف اسباق میں مواد کی تکرار اور گزشتہ اسباق کے مضامین کا اعادہ ارادی اور مطلوب و مقصود ہے۔ غیر ارادی غلطی نہیں۔ ضروری نحوی نکات و مطالب حسب موقعہ آسان انداز میں ضمناً بیان کر دیے گئے ہیں۔ دقیق اور پیچیدہ نحوی مسائل سے دانستہ اجتناب کیا گیا ہے۔ عربی گرامر کی نصابی کتب کی طرح نحوی مباحث کے لیے مستقل عنوانات کے تحت مفصل مباحث اس کتاب میں شامل نہیں کیے گئے۔

۳۔ زیادہ توجہ عام قاری کے لیے فہم قرآن کا راستہ آسان کرنے کی طرف رہی ہے۔ ان اسباق کا ایک اضافی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اردو میں مستعمل عربی کلام کا صحیح تلفظ اور مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

۴۔ مگر ان اسباق کی سب سے امتیازی اور منفرد خصوصیت یہ ہے کہ تمام مثالیں قرآن مجید سے اخذ کی گئی ہیں تاکہ فہم قرآن کا مقصد ہر وقت سامنے رہے اور اس کے حصول کی جانب پیش قدمی برابر جاری رہے۔

۵۔ اسباق کے آغاز میں حسب موقعہ اثنائے بیان میں قارئین کی حوصلہ افزائی اور تشجیع کے لیے دعوتی اسلوب بھی اختیار کیا گیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ کاوش فہم قرآن کی تسہیل میں معاون ثابت ہو۔

۶۔ گرائمر کے بعض قواعد کے ذرا تفصیلی بیان کے لیے ایک مختصر ضمیمہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کا بغور مطالعہ اور حفظِ مطالب مفید ہوگا۔

کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زمان صاحب کے ذہین وفطین شاگرد اورنامور محقق، پروفیسر اورشاعر ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کہتے ہیں کہ:

قرآن مجید کومرکز یا بنیاد بنا کرعربی زبان کی تدریس کا خیال یکسر نیا نہیں۔ ماضی میں بھی اسی نوع کی کوشش ہوچکی ہیں۔ مثلاً عبدالسلام قدوائی ندوی صاحب کا سلسلہ''قرآن مجید کی پہلی کتاب''، ''دوسری کتاب'' وغیرہ اور پروفیسر فروغ احمد صاحب کا ''چالیس اسباق'' کا سلسلہ۔ تاہم ان کتب میں کلیۃً قرآنی ذخیرۂ الفاظ پر انحصار نہیں کیا گیا۔ استاذی ڈاکٹر ایس ایم زمان صاحب کی اس کاوش کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تمام مثالیں قرآن مجید ہی سے اخذ کی گئی ہیں اور گرائمر کی غیر ضروری پیچیدگیوں سے دامن بچاتے ہوئے کامل توجہ تفہیم قرآن پر مرکوز رکھی گئی ہے۔ تاہم اردو میں کثرت سے مستعمل عربی الفاظ کی بنیاد ساخت اور صحیح تلفظ سے آ گاہی بخش کر، یہ اسباق قرآن فہمی میں آسانی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ، ضمنی طور پر اردو کی بھی خدمت کرتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ اسباق بنیادی طور پر عربی صرف ونحو سکھانے کے لیے مرتب نہیں کیے گئے تاہم ان میں صرف ونحو کے تقریباً سبھی اہم مباحث کے اساسی نکات وتصورات نہایت آسان اور جامع انداز میں واضح کر دیے گئے ہیں۔ اس سہولت اور جامعیت کے پس منظر میں ڈاکٹر صاحب کا طویل تدریسی تجربہ کارفرما ہے۔

چونکہ ان اسباق کی ترتیب خالصتاً خدمت قرآن کے لیے عمل میں لائی گئی ہے، اس لیے اُمید واثق ہے اور دلی دعا بھی، کہ یہ ڈاکٹر صاحب اور اس کاوش میں ان کے جملہ معاونین کے لیے صدقہ جاریہ اور توشۂ آخرت ثابت ہو۔ آمین یا ربّ العالمین۔

کتاب کے ناشر ادارہ 'المصباح' ناشران قرآن وکتب اسلامی لاہور کے مدیر مہام جناب صوفی خورشید طارق صاحب دینی لٹریچر کو اعلیٰ معیار پر طبع کرنے کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کو بہترین کاغذ پر اور عمدہ ڈیزائن کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب المصباح، بک لینڈ اُردو بازار لاہور سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ برائے رابطہ:
فون نمبر: 042-37124656

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر رسول بخش رئیس [۱]

ہر طالب علم کا سوال

میں کون سا پیشہ اختیار کروں اور کس شعبے میں جاؤں؟
میرا جواب یہ ہے کہ پہلے 'انسان' بنو اور پھر کوئی بھی پیشہ اختیار کرو
اس کے لیے طالب علم کے ذاتی رجحان اور سوشل سائنسز کی اہمیت بہت زیادہ ہے

ابتدا ہی میں عرض کروں کہ فائدہ مند علم وہی ہوتا ہے جسے حاصل کرنے میں ہمارے دل کی آواز شامل ہو اور ہمارا فطری میلان بھی اسی طرف ہو۔ اپنی تدریسی زندگی کے دوران اکثر بچوں کے والدین میرے پاس آتے اور بار بار ایک ہی سوال کرتے کہ عمرانی علوم کا اس زمانے میں کیا فائدہ ہوگا' اور یہ سند بے شک معیار کی ہے اور آپ کے معیاری ادارے سے جاری ہو گی لیکن یہ روزگار کمانے کا ذریعہ کس طرح بنے گی؟

جب اپنی جامعہ کے بارے میں معلوماتی مجلسوں کا ہم ملک کے مختلف شہروں میں انعقاد کرتے تو تاریخ' سماجیات' فلسفہ اور سیاست کا نام سن کر کہیں لوگ اپنا منہ بھی پھیر لیتے۔ ان کی توجہ زیادہ تر بزنس سکول اور کمپیوٹر سائنس کے اساتذہ پر مرکوز ہوتی۔

ہمارا عملی فلسفہ گھسے پٹے زاویوں سے مختلف رہا ہے کہ طلبہ کی تحقیق کا شعبہ جو بھی ہو سماجی علوم، انگریزی زبان اور طرزِ تعلیم کی بنیادی باتوں میں سب کی گرفت یکساں ہو۔ وہ زندگی میں جو بھی کریں، کسی بھی شعبے یا پیشے سے وابستہ ہوں، بشری علوم سے آگاہی انہیں مہذب اور شائستہ انسان بننے میں مددگار ثابت ہوگی۔ یہ بھی درست ہے کہ تہذیب صرف کتابوں اور درسگاہوں کی محتاج نہیں، مگر آج کے زمانے میں جامعات کی اہمیت کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ان کے کھلے ماحول میں شخصیت سازی کا عمل آگے بڑھتا ہے، جہاں سب خواب جوان ہوتے ہیں کہ آگے چل کر زندگی کے کون سے دھارے میں کس طرح شامل ہونا اور رہنا ہے۔ کئی صدیوں سے مغربی جامعات میں سماجی علوم کو درسگاہوں کی فکری اساس کا درجہ حاصل رہا

---

[۱] پروفیسر لمز (LUMS)، لاہور

ہے اور اب بھی ہے۔ ہم نے سوائے محدود نجی درسگاہوں کے اپنے نوجوانوں کو سیدھا ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی راہ پر ڈال دیا ہے، اس کے علاوہ کسی اور سوچ کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ دیگر ممالک کا زیادہ پتا نہیں مگر ان تمام ایسے شعبوں میں جنہیں آپ تکنیکی یا فنی کہہ سکتے ہیں جامعات کی ڈگری سے گزر کر جانا ہوتا ہے۔

میرے خیال میں معاشرتی علوم کی اہمیت نہ آج ختم ہوئی ہے اور نہ کبھی مستقبل میں ہوگی، مگر نئی معیشت کے تقاضوں نے نوجوانوں کی ترجیحات بدل دی ہیں اور یہ بات قابلِ فہم ہے۔ ہماری نسل جو بڑی حد تک مثالیت پسند تھی، اس کے برعکس آج کا نوجوان دنیا کے ہر خطے میں عملیت پسند ہے اور اس کا سوال بھی وہی ہے جو ایک عرصہ سے ان کے والدین سے سنتا آیا ہوں کہ کوئی مضمون اتنے سال تک پڑھنے کا فائدہ کیا ہوگا؟

افادیت پسندی بھی ایک پرانا فلسفہ ہے اور ہر دور کے انسان کی مادیت پرستی کی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہر انسان بنیادی طور پر افادیت پسند ہے۔ بازار میں جا کر اشیا خرید کرتے وقت موازانہ کرتا ہے اور قیمت کا تعین افادیت سے کرتا ہے کہ وہ اپنا سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتا، اس کی کوشش زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ آج کل کے غالب فلسفے جسے آپ نیولبرلزم یا ہم اپنی زبان میں نو آزادروی کہیں گے، ایک جامع تصور ہے جو زندگی کے سب میدانوں کا احاطہ کرتا ہے۔ پوری دنیا میں ہر آدمی یا طالب علم سے لے کر سیاستدان تک اس کا اسیر نظر آتا ہے۔ یہ تو پرانی بات ہوگئی اور اسے دہرانے کو جی تو نہیں چاہتا مگر پس منظر کے طور پر صرف اتنا کہوں گا کہ ہمارے انکار کے باوجود غیر شعوری طور پر ہر انسان مادیت پرست ہے اور اگر مادیت پرستی میں افادیت کا اضافہ بھی کرلیں تو اس کا دائرہ مذہبی رویوں تک بھی پھیل جاتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنے حال اور مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کلی اختیار رکھتا ہے اور جو فیصلہ ہو، اس کے نتائج کا وہ خود ذمہ دار بھی ہے۔ آزادی جو اس فلسفے کی اساس ہے، وہ ہمیں اپنے راستے متعین کرنے کا حق دیتی ہے، مگر سماجی حالات اور دیگر وجودی عناصر ان راستوں کو مسدود کرتے یا کھولتے ہیں۔ جو مواقع تعلیم اور آگے بڑھنے کے لیے کسی نوجوان کو امریکہ میں میسر آسکتے ہیں وہ شاید ہمیں یہاں نہ مل سکیں۔ زہران ممدانی کے مقام اور

کامیابی تک پہنچنے کے لیے نیو یارک اور وہاں کے معاشرے کی صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہے۔

معافی کا خواستگار ہوں کہ بات طویل ہوگئی۔ میرا اپنا خیال کچھ مختلف ہے' کہ کسی بھی نوجوان کو زندگی میں وہ کچھ کرنا چاہیے جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ اصل بات یہ نہیں کہ ہمارے بچے مادی لحاظ سے کتنا کچھ اپنی زندگی میں سمیٹیں گے مسئلہ یہ ہے کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں' صحتمند اور پُرسکون زندگی گزاریں۔ یہ بڑی گاڑیوں' محلات اور زر و دولت کے بڑے خواب وہ آسودگی بھی شاید مہیا نہ کرسکیں جو اس قسم کے اسباب سے وابستہ کی جاتی ہے۔ ایسی باتیں ظاہر ہے کہ ہم والدین کو تو بتانا پسند نہیں کرتے' مگر صرف گزارش ہی کر دیتے ہیں کہ بچوں کے رجحان کی بہت اہمیت ہے' آپ اپنی مرضی ان پر مسلط نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ کئی واقعات اپنی یادداشت میں محفوظ ہیں کہ والدین کا اصرار بچے یا بچی کو کسی فنی شعبے میں بھیجنے کا تھا، مگر وہ تاریخ، ادب اور سیاسیات کے علوم میں سے کسی ایک میں جانے کی تڑپ رکھتے تھے۔ جہاں جبر ہوا، وہاں ہم نے نتائج ایسے دیکھے جو نا قابلِ بیان ہیں۔ گزارش کروں گا کہ بچوں کی ذہنی اور نفسیاتی صحت کا تقاضا ہے کہ ان کے عملی رجحانات کا خیال رکھا جائے، اور اگر کسی من پسند فنی شعبے کی طرف مائل کرنا ہے تو اس میں جبر کی بجائے فطری شوق کی آبیاری کی جائے۔ ضروری ہے کہ اس پسند کو ان کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ بنایا جائے۔

نجانے کتنے طلبہ ہمارے پاس آئے ہوں گے اور سب نے پہلے پہل ایک ہی سوال پوچھا کہ آپ کے خیال میں مجھے کیا بننا چاہیے؟ میرا جواب بھی ایک ہی رہا ہے کہ پہلے تو اچھا انسان بنیں، اگر یہ بن گئے تو باقی جو بھی بنیں گے اس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ دوسرا، زندگی میں خواب اپنی صلاحیت، استعداد اور تہذیبی ماحول کے پیشِ نظر دیکھیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ اچھا انسان کبھی زندگی میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا بشرطیکہ یہ فقط دعویٰ نہ ہو۔ میرے نزدیک آزادی انسانیت کا بنیادی جوہر ہے۔ اگر ہم کسی کے غلبے میں کھو بیٹھیں تو پھر عاجزی ہی ہمارا مقدر ٹھہرے گی۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور اپنا راستہ خود بنانے کیلئے آزاد سوچ ضروری ہے۔ میری آپ سے درخواست ہوگی کہ اپنے اردگرد بچوں اور نوجوانوں کو زندگی کی سب منزلوں اور راستوں سے آگاہ کریں، مگر فیصلہ ان کے اپنے فطری میلان اور صلاحیت کے مطابق ہو کہ وہ کیا اور کہاں پڑھیں گے اور کون سا پیشہ اختیار کریں گے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۹)

تعلیم و تربیت

وقاص ریاض (۱)

یونیورسٹیوں کو اپنا کردار بدلنے کی ضرورت

دنیا کی رفتار اب انسان کے قدموں سے نہیں مشینوں کی تیزی سے ماپی جارہی ہے۔ ہر روز کوئی نئی ایجاد، کوئی نیا تصور، کوئی نیا انقلاب انسانی زندگی کا نقش بدل دیتا ہے مگر حیرت ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اب بھی ماضی کی دھول میں لپٹی ہوئی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تعلیم کا مطلب صرف کتاب، کلاس اور امتحان ہے۔ سچ یہ ہے کہ تعلیم اب ان تین الفاظ سے آگے نکل چکی ہے۔ آج کے دور میں علم وہ ہے جو سوال پیدا کرے، حل تخلیق کرے اور انسان کو خود اپنی حدود سے آگے لے جائے۔ تعلیمی ادارے کا کام اب صرف نصاب مکمل کرنا، امتحان لینا اور سند دینا نہیں۔ آج علم ہر سکرین پر بہتا ہوا دریا ہے۔ سرچ انجن میں سوال ٹائپ کریں تو ہزاروں جواب سامنے آجاتے ہیں۔ یوٹیوب، آن لائن کورسز اور مصنوعی ذہانت کے بے شمار وسائل نے علم کو ہر ہاتھ کی پہنچ میں دے دیا ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ کیا پڑھایا جائے بلکہ یہ ہے کہ کیسے سکھایا جائے؟ ان حالات میں یونیورسٹی کو نالج سینٹر نہیں بلکہ انوویشن ایکو سسٹم بننا ہوگا۔ ایک ایسا مرکز جہاں تحقیق، تخلیق، ٹیکنالوجی اور انسانیت ایک دوسرے کے ساتھ سانس لیں۔ جہاں طلب علم محض نوٹس لکھنے کی بجائے دنیا کو نئے زاویے سے دیکھنا سیکھیں۔ جہاں علم کلاس روم، لیبارٹری اور سافٹ ویئر کوڈز میں بہنے لگے۔ اب وقت آگیا ہے کہ استاد کی حیثیت ایک رہنما (Mentor) کی ہو جو طالبعلم کو علم نہیں بلکہ فکر کا طریقہ سکھائے۔

مصنوعی ذہانت (AI) نے تعلیم کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اب AI ٹیوٹر خودکار انداز میں پڑھاتے ہیں، ہر طالب علم کے لیے الگ نصاب تیار کرتے ہیں اور چند لمحوں میں تحقیقی مواد جمع کر دیتے ہیں۔ ڈیجیٹل ٹوئنز تجربات کو ورچوئل حقیقت میں بدل دیتے ہیں اور خودکار نظام تحقیق کو ترقی دے رہے ہیں۔ علم اب لکھی ہوئی سطروں سے نکل کر سوچنے والے الگورتھم میں ڈھل رہا ہے۔ ایسے میں اگر یونیورسٹی اب بھی خود کو چاک اور تختے تک محدود رکھے گی تو وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے گی۔ لیکن دوسری انتہا بھی کم خطرناک نہیں۔ آج مارکیٹ نے تعلیم کو

(۱) ریسرچ سکالر فزکس

فاسٹ فوڈ بنا دیا ہے۔ چھ مہینے کا کورس، ایک سال کا سرٹیفکیٹ اور پھر آپ ''پروفیشنل'' بن گئے کی خوش فہمی۔ یہ علم نہیں بلکہ علم کا فریب ہے۔ایسی تعلیم نہ تجزیاتی ذہانت پیدا کرتی ہے نہ سائنسی شعور، نہ سماجی ذمہ داری۔ یہ صرف ہاتھ میں فائل دیتی ہے، دماغ میں روشنی نہیں۔ ہمیں سمجھنا ہوگا کہ تعلیم میں صرف رفتار نہیں، گہرائی اور وسعت بھی چاہیے۔صرف ڈگری نہیں کردار اور نظریہ بھی چاہیے۔صرف سکل (Shill) نہیں شعور بھی ضروری ہے۔صحت مند تعلیمی نظام وہ ہے جو طالب علم کو سوال پوچھنا سکھائے ،تقلید سے نکال کر تحقیق کی طرف لے جائے۔ جہاں غلطی کو جرم نہیں بلکہ سیکھنے کا پہلا قدم سمجھا جائے۔ ہمیں ایسا تعلیمی ڈھانچہ تشکیل دینا ہوگا جہاں طالب علم کو کمروں میں قید نہ رکھا جائے بلکہ دنیا اس کا کلاس روم ہو۔ جہاں وہ کمیونٹی پروجیکٹس میں حصہ لے،سماجی مسائل کو سمجھ کر ان کے حل تلاش کرے اور علم کو اپنی زندگی کا حصہ بنالے۔ ہمیں ایسے گریجوایٹس چاہئیں جو ڈگری لےکر نوکری ڈھونڈنے نہ نکلیں بلکہ مسائل کو دیکھ کر خود مواقع پیدا کریں۔

اساتذہ کو بھی بدلنا ہوگا۔استاد اب معلومات کا واحد منبع نہیں رہا۔اس کے کردار کی نوعیت تدریس سے بڑھ کر تربیت تک پہنچ چکی ہے۔ استاد ایک گائیڈ، ایک ہمدرد، ایک سہولت کار اور ایک کوچ ہے۔جس طرح ایک کوچ کھلاڑی کو فٹنس دیتا ہے استاد بھی طالب علم کی ذہنی فٹنس کو بہتر بنانے میں کردار ادا کرے۔ وہ اسے کتابوں کی حد تک نہیں زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرائے۔اسے بتائے کہ ناکامی بھی ایک تجربہ ہے اور نئے سوال پیدا کرنا اصل کامیابی ہے۔

اسی طرح یونیورسٹی کو طلبہ میں انسانی قدریں بھی اجاگر کرنا ہوں گی۔تعلیم صرف معاشی ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ سماجی ذمہ داری اور اخلاقی شعور کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ایک ماہر انجینئر جو ایماندار نہ ہو، ایک باصلاحیت ڈاکٹر جو اخلاق سے عاری ہو یا ایک ٹیکنالوجسٹ جو سماجی اثرات نہ سمجھے، یہ سب تعلیم کی ناکامی کی علامت ہیں۔علم کا مقصد صرف ذہنوں کو روشن کرنا نہیں بلکہ دلوں کو نرم کرنا بھی ہے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ٹیکنالوجی ،آبادی، معاشی چیلنجز اور عالمی مقابلہ، ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا ہے۔اس ماحول میں وہی قوم کامیاب ہوگی جو تعلیمی میدان میں انقلابی تبدیلیاں لائے گی۔ جو اپنے نوجوانوں کو صرف نوکریاں نہیں، بلکہ ویژن دے گی۔ جو انہیں سوچنا سکھائے گی، ایجاد کرنا سکھائے گی اور سب سے بڑھ کر انسان بننا سکھائے گی۔(بقیہ صفحہ نمبر:۲۱)

تعلیم و تربیت

محمد علی

مصنوعی ذہانت کا انقلاب

اگلے ۲۰ سال میں کام اختیاری اور پیسہ غیر متعلق ہو جائے گا
ایلون مَسک کی پیش گوئی

دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ٹیکنالوجی کا ہر نیا موڑ انسانی زندگی،معیشت اور سماجی ڈھانچوں کو نئے رُخ دے رہا ہے۔ایسے میں ٹیسلا اور سپیس ایکس کے سر براہ ایلون مَسک نے ایک غیر معمولی پیش گوئی کی ہے کہ آنے والے ۱۰ سے ۲۰ سالوں میں کام انسان کے لیے ایک ''آپشنل'' بن جائے گا جبکہ پیسہ اپنی بنیادی اہمیت کھو دے گا۔گزشتہ ہفتے واشنگٹن ڈی سی میں یو ایس سعودی انویسٹمنٹ فورم سے خطاب کرتے ہوئے ایلون مَسک کا کہنا تھا کہ مصنوعی ذہانت (AI) اور روبوٹکس کی ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ آئندہ انسانوں کو اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے محنت ومشقت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ دعویٰ محض ایک خیال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ٹھوس تکنیکی دلائل اور مستقبل بین تصورات موجود ہیں۔ایلون مَسک کے مطابق مستقبل میں انسان کا کام ویسا ہی ہو جائے گا جیسے کسی کا شوق: جیسے کوئی کھانا پکانے،ملبوسات بنانے یا پڑھانے کا کام صرف اس لیے کرتا ہے کہ اسے اس سے لطف آتا ہے،ضرورتاً نہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جب روبوٹک سسٹمز اور AI طاقتور ہو جائیں گے۔ایلون مَسک کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تو دولت کی تقسیم میں یکسانیت آجائے گی کیونکہ جب پیداوار لامحدود ہوگی اور اس کی لاگت نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی تو کرنسی کی اہمیت کم ہو جائے گی۔وہ ایسے مستقبل کو Post Scarcity Society قرار دیتے ہیں یعنی ایک ایسا معاشرہ جہاں کمی اور قلت کا خاتمہ ہو چکا ہو اور ہر شخص اپنی ضروریات آسانی سے پوری کرسکتا ہو۔اس تناظر میں ایلون مَسک AI اور روبوٹکس کو وہ واحد راستہ قرار دیتے ہیں جو پوری انسانیت کو غربت سے نکال کر فراوانی کی طرف لے جاتا ہے۔ٹیسلا کے انسانی مانند روبوٹ ''Optimus'' کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ جب ایسے روبوٹ بڑے پیمانے پر

دستیاب ہوں گے تو زراعت، صنعت، تعمیرات حتیٰ کہ سروسز تک کے شعبوں میں انسانی محنت کی جگہ خودکار نظام لے سکتے ہیں۔

کام اختیاری کیسے ہوسکتا ہے؟

مَسک کی پیش گوئی کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے چند بڑے عوامل اہم ہیں جیسا کہ روبوٹکس کی مکمل خودمختاری۔ اگر روبوٹ انسانی ہاتھ پاؤں کی طرح کام کرنے لگ جائیں، چیزیں اٹھانا، بنانا، ترتیب دینا سب کچھ وہ خود بخود کرسکیں تو پیداواری عمل میں انسان کی ضرورت انتہائی کم ہو جائے گی۔ اس کی شروعات آج ہی دیکھنے کو مل رہی ہے جہاں خود کار فیکٹریاں، AI سے چلنے والی مشینیں اور خودکار ڈرائیونگ سسٹمز عملی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ آج کے AI سسٹمز بات سمجھنے، لکھنے اور فیصلہ سازی جیسے کام حیرت انگیز درستگی سے کررہے ہیں۔ آنے والے برسوں میں جب یہ سسٹمز مزید ترقی کریں گے تو یہی باقی ماندہ ذہنی کام بھی سنبھال لیں گے جو روایتی طور پر صرف انسان کرتے آئے ہیں۔ جہاں تک پیداواری لاگت کے تقریباً خاتمہ کی بات ہے تو یہ بھی کوئی رومانی تصور نہیں بلکہ تکنیکی انداز سے جب مشینیں سستی ہوجائیں گی اور توانائی کے ذرائع زیادہ دستیاب ہوں گے تو اشیا کی تیاری اتنی سستی ہو جائے گی کہ کمی کا تصور ختم ہونے لگے گا۔ درآمدات، مینوفیکچرنگ اور زراعت تمام شعبوں میں اخراجات کم سے کم ہوتے جائیں گے۔ جب زیادہ تر کام روبوٹ کریں گے تو لازمی ہے کہ دولت کی تقسیم کا کوئی نیا طریقہ اپنایا جائے۔ مَسک کے مطابق مستقبل میں Universal High Income یا ایسا مالی نظام ضروری ہوگا جس میں ہر شخص کو بنیادی سہولیات کی فراہمی خودکار نظاموں کی آمدنی سے ہوسکے۔

ممکنہ اثرات اور بڑے چیلنجز

اگرچہ یہ سب کچھ روشن مستقبل کی تصویر دکھاتا ہے لیکن اس سمت میں بڑے خطرات اور سماجی مسائل بھی سامنے آسکتے ہیں جیسا کہ بے روزگاری اور معاشرتی بے چینی، دولت کی مرکزیت اور عدم مساوات اور انسانی شناخت کا بحران۔ جیسے جیسے خودکار نظام بڑھتے جائیں گے لاکھوں لوگ اپنی نوکریاں کھوسکتے ہیں۔ اگر حکومتیں اور معاشرے پہلے سے تیار نہ ہوئے تو

بڑی سماجی بے چینی جنم لے سکتی ہے۔ اگر چند بڑی کمپنیاں AI اور روبوٹکس کی مالک رہیں تو دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے گی اور بقیہ معاشرہ روبوٹک معیشت سے فائدہ نہیں اٹھا پائے گا۔ نیز یہ کہ کام ہمیشہ سے انسان کی شناخت اور مقصدیت کا ذریعہ رہا ہے، جب محنت کی ضرورت ہی ختم ہو جائے تو بہت سے لوگ اپنے وجود کا معنی تلاش کرنے میں مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

ایلون مَسک کے مستقبل کے اس تصور سے فائدہ اٹھانا ہے تو ابھی سے تیاری کرنا ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ حکومتی پالیسی اور طویل المدت منصوبہ بندی کی جائے اور انسانی مہارتوں کی ترقی پر کام کیا جائے۔ آئندہ ۲۰ سال کے لیے AI اور روبوٹک دور کی معاشی پالیسی تشکیل دینا ضروری ہے۔ تعلیم کے نظام میں بھی جامع تبدیلیوں کی ضرورت ہوگی۔ ایسی مہارتیں بڑھانی ہوں گی جنہیں مشینیں تبدیل نہیں کر سکتیں اور تکنیکی مہارتیں جیسے AI، ڈیٹا سائنس، روبوٹکس اور آٹومیشن کی تربیت بھی ناگزیر ہے۔ ایلون مَسک کا ویژن ایک ایسا مستقبل پیش کرتا ہے جہاں انسان محض اپنی زندگی گزارے گا جبکہ روایتی محنت کا کام مشینوں کے سپرد ہو جائے گا۔ یہ تصور بظاہر سائنس فِکشن لگتا ہے مگر موجودہ تکنیکی شرحِ ترقی کو دیکھتے ہوئے اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس مستقبل کی خوبصورتی بروقت منصوبہ بندی، قانون سازی، تعلیم، ماحول اور معاشرتی سوچ میں تبدیلی سے مشروط ہے ورنہ یہی انقلاب بے روزگاری، عدم مساوات اور سماجی انتشار کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

بقیہ: یونیورسٹیوں کو اپنا کردار بدلنے کی ضرورت

تعلیم کا مستقبل اس بات میں نہیں کہ ہم کتنا پڑھاتے ہیں بلکہ اس میں ہے کہ ہم کتنا سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر ہم نے اس حقیقت کو نہ سمجھا تو ہم ڈگریاں تو بانٹ دیں گے مگر دانش کا چراغ نہیں جلا سکیں گے۔ یہ وقت ہے کہ ہم تعلیم کو دوبارہ دریافت کریں۔ اسے جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں اور اپنی یونیورسٹیوں کو تخلیق، تحقیق اور انسانیت کے مراکز بنائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جو ہماری نوجوان نسل کو روشن مستبقل کی طرف لے جا سکتا ہے۔

پاکستانیات

انجینئر گلبدین حکمت یار[۱]

پاکستانی ارکانِ پارلیمنٹ کے نام کھلا خط

[پاکستان کو افغانوں کا دوست ہونا چاہیے نہ کہ دشمن]

میری طرف سے سلام، احترامات اور نیک تمنائیں قبول فرمائیں؛ افغانستان اور پاکستان کے درمیان کشیدہ جنگی صورتحال کے بارے میں چند گزارشات پیش ہیں:

ہم اسلام آباد سے خطرناک اطلاعات اور تباہ کن نتائج کے امکانات سن رہے ہیں؛ براہِ راست جنگ کے خدشات لاحق ہیں؛ ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ عقلمند اور مؤمن پاکستانی اور پارلیمنٹ کے اراکین خاموش کیوں ہیں اور ایسے غیر ذمہ دارانہ خطرات کی روک تھام کیوں نہیں کرتے؟

کیوں وہی ہو رہا ہے جو بھارت چاہتا ہے؟ کیوں بی ایل اے اور ٹی ٹی پی کا انتقام افغان قوم اور افغان مہاجرین سے لیا جا رہا ہے؟ اُن کے آپریشنز تو اس وقت شروع ہوئے جب نیٹو کی افواج افغانستان میں موجود تھیں؛ امریکا نے بھارت کو اجازت دی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف مسلح عناصر کو تربیت دے اور پروان چڑھائے۔

دو مسلم ہمسایہ ممالک خطرناک جنگ کے دہانے پر ہیں؛ کئی ملین مہاجرین جبراً توہین اور بے عزتی کے ساتھ نکالے جا رہے ہیں اور ان کے گھر بلڈوزروں سے مسمار کیے جا رہے ہیں، کیا یہ رحم، شرافت اور انسانی اخلاق کے خلاف نہیں؟

ہم نہیں سمجھتے کہ پاکستانی پارلیمنٹ اس حسّاس صورتحال کے بارے میں واضح اور قاطع مؤقف کیوں نہیں اختیار کرتی اور برے نتائج کے تدارک کے لیے کیوں اقدامات نہیں کرتی؟ ایک ایسی سربلند قوم پر یہ ذِلت آمیز سلوک اور ملک پر حملے کے خدشات موجود ہیں جو ہمسایوں کی غلط پالیسیوں کی قیمت ادا کر رہی ہے۔ نصف صدی پر محیط ایسی خونی جنگوں میں اس قوم کے لوگ شہید ہوئے، بیرونی جارحین نے یہ مصائب مسلّط کیے، دیہات اور گھر تباہ ہوئے، لوگ ہجرت پر مجبور ہوئے اور بے شمار شہداء دیے؛ یہ سب سوویت افواج اور بعد ازاں امریکا و

[۱] امیر حزب اسلامی افغانستان۔ اُردو ترجمہ: مستیار

نیٹو کے ظالمانہ حملوں کے نتائج ہیں۔

سویت افواج محض افغانستان پر قبضے کے ارادے سے ماسکو سے روانہ نہیں ہوئیں؛ اُن کا ہدف ہمارے وطن تک محدود نہ تھا۔ اُن کے سپاہیوں کا نعرہ یہ تھا کہ وہ اپنے جوتوں کے تسمے کراچی کے ساحل پر جا کر کھولیں گے۔ اگر افغانستان میں سرخ فوج کی مکمل مزاحمت نہ کی جاتی تو یقیناً یہی انجام ہوتا، پاکستان نہ صرف سویت فوج کا گھرانہ بن چکا ہوتا بلکہ روس اور بھارت کے مشترکہ حملے کا نشانہ بنتا اور نتیجہ بلاشبہ نہایت سنگین اور ناقابلِ تلافی ہوتا۔

افغانوں کے جہاد و مزاحمت نے اسی خطرناک انجام سے پاکستان کو بچایا، یہی مزاحمت تھی جس نے ماسکو و دہلی کے مشترکہ حملے اور ملک کے ٹکڑے ہونے کے عمل کو ناکام بنایا، جو ہر وطن پرست اور بصیرت رکھنے والا پاکستانی اس سچائی کو محسوس کرتا ہے اور اس کا اعتراف کرتا ہے۔

مجھے وہ دن یاد ہیں جب عام پاکستانی سے لے کر صدرِ مملکت تک ہر زبان پر یہی نعرہ سنائی دیتا تھا: "افغان جہاد، پاکستان کی دفاعی دیوار ہے۔" آپ خود بھی وہی روز یاد کریں گے جب اس وقت کے صدر مرحوم جنرل ضیاء الحقؒ نے اُن سوویت نواز اور افغان جہاد کے مخالف حلقوں کے جواب میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا:

"کچھ لوگ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ افغان مہاجرین پاکستان میں ہمیشہ کے لیے رکنے کا ارادہ رکھتے ہیں؛ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افغان ایک وطن دوست قوم ہے، وہ اپنی سرزمین کی آزادی کے لیے قربانیاں دے رہا ہے، جس دن اُن کا وطن آزاد ہوگا، سب واپس لوٹ جائیں گے اور اگر کچھ غلط فہمی یا بعض افراد کے غلط اندازوں کے باعث چند لوگ یہاں رہ بھی گئے تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا دس کروڑ پاکستانی تین ملین محنت کش افغانوں کو برداشت نہیں کر سکتے؟" مَیں بھی ہندوستان کا مہاجر ہوں اور میری مانند لاکھوں دوسری مہاجرین بھی اسی سرزمین پر آباد ہیں۔

کیا پوری افغان قوم توہین کی مستحق ہے اور اسے 'نمک حرام' کہنا درست ہے؟ افغانوں نے پاکستان کی مہربانی کو کبھی بھلایا نہیں، اُنہیں پناہ دی گئی، افغانوں کے اسلامی جہاد اور آزادی کے لیے ہونے والی جدوجہد کی پاکستان نے حمایت کی؛ مگر یہ تو وہی عمل تھا جس کا

اسلام اور اخلاقی ذمہ داری تقاضا کرتی تھی اور عملی طور پر اُس کے علاوہ کوئی معقول اور عقلی متبادل بھی موجود نہ تھا۔

بہت سے مہاجرین وہ ہیں جو سوویت حملے کی وجہ سے پاکستان آئے؛ اُن کے ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد گھر اسی مشترک دشمن کے ہاتھوں تباہ ہوئے، اُنہوں نے اپنے جوان بیٹوں کو محاذوں پر چھوڑا، ایک کے بعد دوسرے شہید ہوئے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر اُن کی قربانی اور مزاحمت نہ ہوتی تو افغانستان کے بعد پاکستان کس انجام سے دوچار ہوتا؟ اگر روس مغرب سے حملہ آور ہوتا اور بھارت مشرق سے، تو پاکستان کے اندر روس نواز اور بھارت نواز جماعتیں بالکل وہی کام انجام دیتیں جو ان کے ساتھیوں نے افغانستان میں کیے۔

کیا وہ لوگ جو آج افغانوں کو ''نمک حرام'' کہتے ہیں، انہیں یہ یاد بھی ہے یا نہیں کہ انہی جماعتوں نے پاکستان کے شہروں میں سرخ پرچم لہرا کر جشن منایا اور سویت افواج کے داخلے کے خیر مقدم میں رقص کیے تھے؟ کیا اُنہیں یہ بات یاد نہیں کہ اُس وقت کے صدر بار بار کہتے تھے:

''ہم افغان مجاہدین کے احسان مند ہیں جنہوں نے روسی افواج کو روکا؛ اگر وہ اور اُن کی مزاحمت نہ ہوتی تو پاکستان میں روس کا مقابلہ ممکن ہی نہ تھا۔ اگر وہ افغان پہاڑوں اور تنگ وادیوں سے گزر کر یہاں آتے تو ہمارے ہموار میدانوں میں اُن کا مقابلہ یقیناً محال ہوتا۔''

ہم سوال کرتے ہیں کہ وہ بیانات اور اعترافات جو پینتیس سال قبل سچ ثابت ہوئے، آج حکمران سطح پر کیوں نظر نہیں آتے؟ آج ۲۰۲۵ء میں پاکستان کی آبادی اُس دور کے مقابلے میں تقریباً ڈھائی گنا (تقریباً ۲۵۵ ملین) ہو چکی ہے؛ اس کے باوجود جب کل یہ مظلوم مہاجر یہاں موجود تھے تو قوم کا دل کیوں بے چین نہ ہوا اور آج برداشت کیوں کم ہوگئی؟ کیوں وہ محسن جنہوں نے مدد کی، آج اُنہیں ''نمک حرام'' کہا جاتا ہے؟

اور انہی مظلوم مہاجرین کے گھر بلڈوزروں سے مسمار کیے جا رہے ہیں، وہی گھر جنہیں اُنہوں نے اپنے ہاتھوں کی محنت اور پسینے سے بنائے تھے، مگر آج پاکستانی پولیس انہی خاندانوں کو زبردستی اُن کے گھروں سے نکال رہی ہے، بے مثال بے حرمتی اور تحقیر کے ساتھ اور پھر اُن گھروں کو بلڈوزروں سے مسمار کر دیتی ہے!

کیا کوئی صاحبِ عقل پاکستانی اس بات سے انکار کی جرأت کرے گا کہ اگر پاکستان ایک مضبوط ایٹمی اور اسلامی مملکت بنا ہے تو اس میں افغان جہاد کا بڑا حصہ ہے؟ اگر وہ جہاد نہ ہوتا تو امریکہ کبھی بھی پاکستان کو ایٹمی ہتھیار بنانے کی اجازت نہ دیتا۔

اگر پچھلے مہاجرین پاکستان میں ٹھہر گئے ہوں یا امریکہ کی جانب سے مسلط کردہ جنگ کی وجہ سے مزید مہاجرین پاکستان آئے ہیں، تو اسلام آباد اس میں پوری ذمہ داری کے ساتھ شریک ہے؛ کیونکہ افغانستان پر حملے میں اس نے امریکہ کی کھلی مدد کی، امریکہ کا حملہ بھی پاکستان کی فضاؤں اور زمینی راستوں کے ذریعے ہوا اور اس کے اقدامات کی تکمیل بھی پاکستان کی راہداریوں سے ہوئی۔

جنرل پرویز مشرف نے کتنے ایسے افغان قیدی ہاتھ باندھے ہوئے امریکہ کے حوالہ کیے؟ اگر روسی افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں واقعی عوامی رضامندی سے کوئی حکومت قائم ہو جاتی اور اگر اسلام آباد نے کے جی بی (KGB) اور سی آئی اے (CIA) کے پسندیدہ اتحاد کی سرپرستی یا امداد نہ کی ہوتی، تو نہ تو مہاجرین آج تک اسی طرح پاکستان میں ٹھہرے رہتے، نہ امریکہ کے ذریعے افغانستان کا بیس سالہ تسلط اس حد تک پہنچتا اور نہ آج ہم پاکستان اور افغانستان کو ایک خونی، داخلی تصادم کے دہانے پر کھڑا دیکھ رہے ہوتے!

افغانستان میں جاری یہ جنگ اُس وقت شروع ہوئی جب ماسکو نے سردار داؤد کی قیادت میں روس نواز کمیونسٹ افسروں کے ذریعے ایک فوجی بغاوت کروائی، شاہی نظام کا خاتمہ کیا گیا اور اقتدار کمیونسٹوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا، اسی دور میں پاکستان میں دھماکوں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُس وقت یہاں پیپلز پارٹی کی حکومت تھی، مَیں سردار داؤد حکومت کے تعاقب میں تھا اور مجھے میری غیر موجودگی میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ حزبِ اسلامی کے کئی کارکن گرفتار اور بعض شہید کیے گئے تھے۔ کچھ افغان اور پاکستانی بھائیوں نے اطلاع دی کہ وہاں کی حکومت ہمیں پناہ دینے کے لیے تیار ہے، اس لیے مَیں وہاں گیا، ایک ایسے وقت میں جب روزمرہ دھماکوں کی آوازیں معمول بن چکی تھیں۔

اُس زمانے میں صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ حیات محمد شیر پاؤ کا قتل ہوا؛ قاتل کابل میں

تربیت یافتہ تھا اور ایک ایسی تنظیم سے منسلک تھا جس کے بڑے سردار کابل میں مقیم تھے اور اُن کا ارادہ یہ تھا کہ ببرک کے انداز میں روسی جہاز اور ٹینک اسلام آباد پہنچائے جائیں۔ داؤد کی بغاوت سے منسلک عناصر نے پاکستان میں سرخ جھنڈے لہرائے، سرخ ٹوپیاں پہن کر روسی افواج کے استقبال میں رقص کیا اور اپنے اشعار و نعروں میں اُنہیں آمد کی دعوت دی۔

جو لوگ تاریخی حقائق سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ پاکستان میں دھماکوں اور دہشت گردی کا سلسلہ اُسی وقت شروع ہوا اور یہ سلسلہ اُس وقت ختم ہوا جب افغان مہاجرین کی پہلی لہریں پاکستان میں داخل ہوئیں۔ ان مہاجرین نے پاکستان کے امن و استحکام میں مدد کی، نہ کہ بدامنی پیدا کی۔ پاکستان میں بدامنی یا تو اُس کے طاقتور مخالفین کی مداخلت کا نتیجہ ہے یا پھر اسلام آباد کی غلط اور ناکام پالیسیوں کا۔

یقیناً آپ اس بات سے واقف ہوں گے کہ ایران نے پاکستان سے بھی زیادہ افغان مہاجرین کو ملک سے نکال دیا تھا، لیکن آج وہی ایران کابل حکومت سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ دو لاکھ افغان شہریوں کو مزدوروں کے نام پر ایران بھیجا جائے۔ اس معاملے میں کابل کا رویہ سرد اور خاموش ہے، جبکہ تہران میں غیر معمولی عجلت اور بے چینی پائی جاتی ہے حتیٰ کہ اُس نے نو ماہ کے ویزے جاری کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔

دانشمند اور خطے کی حساس صورتحال سے آگاہ لوگ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس فیصلے کے پیچھے اصل عوامل کیا ہیں۔ خطے کی جنگی فضاء، ایران کے خلاف امریکہ اور اسرائیل کی بڑھتی ہوئی دھمکیاں، کابل کے خلاف پاکستان کی جانب سے حملے کے خدشے، یہ سب وہ اسباب ہیں جنھوں نے تہران کو قندھار کے ساتھ اس نوعیت کا معاہدہ کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ بیشتر سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ یہ اقدام افغانستان اور ایران کے درمیان ممکنہ جنگی صورتحال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔

اگر پرانی باتیں بھول گئی ہوں تو یاد کیجیے، جب طالبان چار سال پہلے کابل میں داخل ہوئے تھے؛ تو اسلام آباد خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ مبارکباد کے مسلسل پیغامات وائرلیس (wireless) کے ذریعے بھیجے گئے۔ اعلیٰ سطح کے وفود روانہ کیے جا رہے تھے اور کچھ پاکستانی

حکام فخر سے اعلان کر رہے تھے کہ: ''یہ پاکستان کی عظیم کامیابی ہے، طالبان کو دوبارہ کابل تک پہنچانے والے ہم ہی ہیں!''

لیکن پھر کیا ہوا؟ وہی کل کے دوست آج ایسے دشمن بن گئے کہ پاکستانی جنگی طیارے کابل کے ارگ کے قریب اہداف پر بم برسا رہے ہیں! پاکستان کہتا ہے کہ یہ حملے تحریکِ طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے ٹھکانوں اور ان کے سربراہ کے قافلے پر کیے گئے ہیں، مگر طالبان اس کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''یہ تو صرف تیل کے ایک ٹینکر کا دھماکہ تھا!'' حقیقت کسی باشعور افغانی یا پاکستانی پر پوشیدہ نہیں۔

ڈیورنڈ لائن کے ساتھ پھیلے نو صوبوں میں خونی جھڑپیں ہوئی ہیں؛ سیکڑوں جانیں ضائع اور زخمی ہوئی ہیں اور استنبول مذاکرات کے دوسرے مرحلے کے دوران پاکستان کے وزیرِ دفاع کہتے ہیں: "اگر مذاکرات بے نتیجہ رہے تو ہم طالبان کے ساتھ براہِ راست جنگ شروع کر دیں گے" اور انہی دھمکیوں کے جواب میں بھارت نے کہا: "ہم طالبان کے ساتھ کھڑے رہیں گے" امریکی صدر ٹرمپ بار بار کہتے رہے کہ وہ افغانستان اور پاکستان کے تنازعے کو بہت جلد اور بآسانی حل کر دیں گے؛ مگر انہی کے سابق سفیر کے کابل پہنچ کر اعلیٰ حکام سے ملاقاتوں کے بعد یہ بیان سامنے آیا کہ پاکستان اور افغانستان کی حالیہ جھڑپوں نے امارتِ اسلامیہ (طالبان) کی بین الاقوامی ساکھ کو بڑھایا اور ثابت کیا کہ طالبان خودمختار اور آزاد ہیں۔ یہ موقف درحقیقت طالبان کو جنگ کی طرف ابھارنے جیسا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص درحقیقت کس کا نمائندہ یا ترجمان بن کر بول رہا ہے؛ امریکہ کا یا بھارت کا؟ وہ کس کے لیے جنگ کو فروغ دے رہا ہے اور کس کے مفاد کے لیے لابی کر رہا ہے؟

بہتر ہوگا کہ اس سلسلے میں اُس وقت کا ایک واقعہ آپ کے سامنے رکھوں، جب وائٹ ہاؤس اور کریملن کے درمیان یہ طے پایا کہ سوویت افواج عزت اور امن کے ساتھ، اس طرح کہ ان کے قافلوں پر کوئی حملہ نہ ہو، افغانستان سے نکل جائیں۔ نجیب کی حکومت جوں کی توں برقرار رہے، ماسکو کی مالی اور فوجی امداد بھی اُسی کے لیے جاری رکھی جائے، جبکہ مجاہدین

کے لیے تمام امداد بند کر دی جائے۔اسی منصوبے کے تحت کابل میں ایک ایسی مشترکہ حکومت تشکیل دی جائے جو واشنگٹن اور ماسکو؛ دونوں کی مرضی سے وجود میں آئے، اور جس میں سوویت نواز کمیونسٹ اور امریکہ نواز مغرب پرست عناصر اکٹھے ہوں۔

اس مجوزہ حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سوویت یونین کی نامکمل جنگ کو ان کے ایجنٹوں کے ذریعے مکمل کیا جائے، افغان قوم کو غیر مسلح کیا جائے، اور افغانستان میں مجاہدین کے ہاتھوں ایک خالص اسلامی حکومت کے قیام کو روکا جائے، اس معاہدے پر سوئٹزرلینڈ میں دستخط ہوئے۔

امریکہ نے اُس وقت اعلان کیا کہ وہ چاہتا ہے کہ سوویت افواج عزت کے ساتھ افغانستان سے نکل جائیں اور ان کے انخلاء کے دوران اُن کے قافلوں پر کوئی حملہ نہ کیا جائے۔ہم نے اس معاہدے کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ محض وائٹ ہاؤس اور کریملن کے درمیان ایک مفاہمت ہے؛ افغان اس میں نہ موجود ہیں اور نہ ہی وہ اس کے وعدوں اور ذمہ داریوں کے پابند ہیں۔ہم نے کہا کہ مجاہدین کے حملے سوویت افواج کے خلاف اس وقت تک جاری رہیں گے جب تک آخری سوویت سپاہی سرحد پار نہ کر جائے۔

اسی دوران پاکستانی حکام نے مجھے بتایا کہ ایک بلند پایہ امریکی افسر مجھ سے ملاقات کا خواہشمند ہے؛ اُس کے پاس آپ کے لیے ایک خاص اور اہم پیغام ہے۔ہمیں معلوم نہ تھا کہ پیغام کیا ہوگا۔ملاقات کے دوران میں نے ایسی باتیں سنیں کہ حیران رہ گیا، اس افسر نے مجھے بتایا کہ صدر ریگن کا پیغام یہ ہے کہ:

''صدر نے آپ کو اپنا سلام اور نیک تمنائیں بھیجی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے سوویت افواج کے خلاف حملوں کی استقامت کے عزم کو سراہتے اور حمایت کرتے ہیں......''

مجھے حیرت ہوئی کہ ایک طرف صدر ریگن گورباچوف کے ساتھ یہ عہد کر رہے ہیں اور سارے عالَم کے سامنے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ سوویت افواج باوقار اور محفوظ انداز میں افغانستان سے نکل جائیں، مگر پردے کے پیچھے وہ میری اس پالیسی کی ستائش بھی فرماتے ہیں کہ مجاہدین کے حملے اسی شدت سے جاری رہیں جب تک آخر کار آخری روسی فوجی

سرحد عبور نہ کر جائے۔

آج وہی پرانی کہانی ایک بار پھر دہرائی جا رہی ہے، افغانستان اور پاکستان کے درمیان جنگ کے معاملے میں بظاہر ایک بات کہی جاتی ہے، مگر پسِ پردہ اس کے سو فیصد برعکس پالیسی اپنائی جاتی ہے۔ پاکستان کے مسلح مخالفین نہ تو طالبان نے پیدا کیے ہیں اور نہ ہی کسی اور دوسرے افغان گروہ نے؛ یہ عناصر بیس سالہ امریکی قبضے کے دوران وجود میں آئے اور فعال ہوئے، اگر بھارت نے واقعی کچھ گروہوں کی سرپرستی یا تربیت کی ہے، تو اس کی ذمہ داری براہِ راست امریکہ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اسی نے بھارت کو افغانستان کے راستے پاکستان کے خلاف خفیہ سرگرمیوں کی اجازت دی تھی، لہٰذا اگر پاکستان کو کسی سے شکایت ہے تو وہ امریکہ سے ہونی چاہیے، افغانوں سے نہیں۔

اسی حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پاکستان نے امریکہ سے ناراض ہو کر ۲۰۰۴ء میں دوبارہ طالبان کی حمایت شروع کی اور یہ سلسلہ ۲۰۲۱ء تک جاری رکھا۔

پاکستان کی ایک مذہبی و سیاسی جماعت کے سربراہ نے اُس وقت حکومت سے سوال کیا تھا: ’’آپ نے تیس ہزار پاکستانی نوجوان (طالبان) افغانستان میں جنگ کے لیے کیوں بھیجے؟‘‘ یہ نوجوان نہ تو سوویت یونین کے خلاف جہاد کے لیے بھیجے گئے تھے اور نہ ہی امریکہ کے خلاف؛ بلکہ انہیں داخلی خانہ جنگی اور افغان طالبان کی پشت پناہی کے لیے بھیجا گیا تھا، ان میں سے ہزاروں نوجوان امریکہ کے حملوں کے آغاز میں اور افغانستان کے شمالی علاقوں میں یا تو بموں اور راکٹوں سے ہلاک ہوئے یا پکڑے جانے کے بعد قتل کر دیے گئے اور بعض کو طویل قید و بند کے بعد پاکستان کے سپرد کیا گیا۔

امید ہے کہ ان حقائق کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اسلام آباد افغانستان کے بارے میں ایک نئی، تعمیری اور دائمی سیاسی حکمتِ عملی اپنائے گا، ایسی حکمتِ عملی کہ دونوں مسلمان ہمسایہ ممالک اپنے تنازعات کو عدل و انصاف، معقولیت اور تحمل و تدبّر کے ساتھ حل کرنے کے قابل ہوں، بغیر ایک دوسرے کے اندرونی امور میں مداخلت کے اور بغیر مسلح مخالف قوتوں کی حمایت یا سرپرستی کے۔

پاکستانیات مدیر

'بدل دو نظام' - آئیڈیا اچھا ہے مگر....

نظام بدلنا بہت اہم ہے لیکن نظام کو کیسے بدلا جائے؟ اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے

* ''بدل دو نظام'' بہت عمدہ نعرہ ہے جو تحریکی قیادت نے ارکان و کارکنان کو اجتماع عام ۲۰۲۵ء کے لیے دیا ہے اور انہیں متحرک و بیدار کرنے میں یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے لیکن....

* جماعت اسلامی پاکستان کو سیاسی جد و جہد کرتے ہوئے ۸۷ سال ہو چکے ہیں لیکن اسے نظام بدلنے میں کامیابی نہیں ہوئی لہٰذا ضروری ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ جماعت اسلامی ۸۷ سالہ سیاسی جد و جہد سے نظام بدلنے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکی؟ اور اب وہ کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟

* محترم امیر جماعت نے اہل جماعت اور اہل پاکستان کو اجتماع میں آنے کی دعوت دیتے ہوئے نظام بدلنے کے لیے مندرجہ ذیل لائحہ عمل دیا ہے:

- شہری حکومتوں کا نظام: با اختیار بلدیاتی نمائندے، بیوروکریسی اور افسر شاہی کے شکنجے سے آزادی
- تعلیم: سب کے لیے ایک معیار، ایک نظام
- عدالتی نظام: سستا، آسان اور جدید آن لائن نظامِ انصاف
- کمیونٹی کی سطح پر مصالحتی کونسلیں، پنچایتیں اور قاضی عدالتوں کا قیام
- متناسب نمائندگی کی بنیاد پر انتخابات، ہر ووٹ حکومت کی تشکیل میں مؤثر
- زکوٰۃ کی بنیاد پر آزاد اور باوقار معاشی نظام
- سود اور آئی ایم ایف کی غلامی کا خاتمہ
- فری آئی ٹی ایجوکیشن، روزگار اور ''اسٹارٹ اپس'' کے لیے غیر سودی قرضوں کی فراہمی

- خواتین کے لیے تعلیمی، تحفظ، وراثت میں حق کی ضمانت
- مزدوروں کے حقوق کا تحفظ
- کسان راج: عام کسانوں میں زمینوں کی منصفانہ تقسیم اور زرعی مراعات، جاگیرداری کا خاتمہ
- آزاد خارجہ پالیسی: امریکی غلامی سے نجات اور قومی وقار پر مبنی عالمی تعلقات
- پولیس ریفارمز

اس لائحہ عمل کو دیکھ کر دل میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ نظام بدل دینے کے نسخے میں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے، جو بنیادی چیز ہونی چاہیے تھی وہ یہ تھی کہ ''سیکولر نظام'' کی جگہ ''اسلامی نظام'' آنا چاہیے تھا لیکن امیر جماعت کے تجویز کردہ اس پیکیج میں سب کچھ ہے سوائے ''اسلامی نظام'' کے لفظ و معنی کے۔

دوسرے یہ کہ فرضاً مان لیا جائے کہ امیر محترم کے مجوزہ نکات پر عمل کرنے، کرانے سے 'نظام' بدل جائے گا لیکن بنیادی سوال تو پھر وہیں باقی رہا کہ ان نکات پر عمل جماعت کیسے کرے گی اور کیسے کرائے گی اور ان نکات کا مدعا حاصل کیسے ہوگا؟ اگر جماعت پچھلے ۷۸ سال کی جدوجہد سے ان نکات پر عمل نہیں کرو اسکی تو اب ان پر عمل کیسے کروائے گی؟

پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا نظام کے اندر رہ کر نظام کو بدلا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب ''ہاں'' میں نہیں دیا جاسکتا کیونکہ کوئی نظام اپنے خلاف کام کرنے اور خود کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یعنی پاکستان میں مروج مغربی جمہوریت (جس میں کاغذی طور پر کچھ اسلامی اصول ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے) کے تحت اگر ہم انتخابات میں حصہ لیتے رہیں جیسے پچھلے ۷۸ سال سے لے رہے ہیں تو کیا ہم اقتدار میں آجائیں گے؟ سوال یہ ہے کہ پہلے اگر نہیں آئے تو اب کیسے آجائیں گے؟ اور فرض کیجیے اگر آبھی جائیں تو کیا ہم موجودہ نظام بدل کر نیا اسلامی نظام لاسکیں گے؟

اوّل تو ہمیں پتا ہی نہیں کہ نیا اسلامی نظام کیا ہوگا اور کیسا ہوگا؟ اس پر ہمارا ہوم ورک ہے ہی نہیں۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آیا تو اس نے کئی دفعہ جماعت اسلامی کے وزراء سے کہا کہ اسلامی نظام کی تفصیل لاؤ میں اسے نافذ کرتا ہوں لیکن جماعت کوئی نقشہ پیش نہ کرسکی۔ اِس وقت جو نقشہ امیر جماعت نے پیش کیا ہے، وہ اور کچھ ہوسکتا ہے بہر حال غلبۂ اسلام کا نقشہ نہیں ہے۔ آپ خود دھیان سے پڑھ لیجیے اور اس میں غلبۂ اسلام ڈھونڈ لیجیے۔

فرض کیجیے آپ کو انتخابات میں اکثریتی ووٹ مل جائیں، آپ اقتدار میں آجائیں تو یہ فوج، یہ پولیس، یہ عدلیہ، یہ بیوروکریسی اور ان کی پشت پر موجود اسلام اور مسلم دشمن مغربی طاقتیں آپ کو نظام تبدیل کرنے دیں گی؟ کیا انہوں نے ملا عمرؒ کو اس کی اجازت دی، مرسیؒ کو اس کی اجازت دی، الجزائر کے الجبھة الاسلامیہ کو اور فلسطین کے حماس کو اس کی اجازت دی؟ ان کی بات چھوڑیے کیا جب ایم ایم اے کو خیبر پی کے میں حکومت ملی تو کیا جماعت وہاں کا 'نظام' بدل کر اسلامی کرسکی؟ اسلام کا کیا نظام اور نقشہ وہاں پیش کیا گیا؟ عرصے بعد ایک چیز ''حسبہ بل'' کے نام پر پیش کی گئی تو سپریم کورٹ نے اسے ردّ کر دیا۔ آپ دور نہ جایئے۔ آپ نے کراچی میں بلدیاتی انتخابات جیتے کیا آپ کا میئر بننے دیا گیا؟ بعض سادہ لوح کہتے ہیں کہ ایم ایم اے کی حکومت صرف صوبے میں تھی اس لیے کچھ نہ کرسکی۔ اگر سارے ملک میں ایم ایم اے کی حکومت ہوتی تو ہم نقشہ بدل دیتے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ پھر بھی کچھ نہ کر پاتے۔ یہ فوج، یہ عدلیہ، یہ بیوروکریسی، یہ پولیس آپ کو کچھ نہ کرنے دیتی۔

آپ کہیں گے کہ پھر پاکستان میں نظام کیسے بدلا جاسکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف عوام کی قوت سے۔ یاد رکھیے پاکستان میں غلبۂ دین اور تبدیلیٔ نظام صرف اس وقت ممکن ہے جب آپ مولانا مودودیؒ کی فکر پر عمل کریں جو انہوں نے علی گڑھ میں پیش کی تھی (جس کے اہم اقتباسات اس شمارے میں موجود ہیں) کہ آپ افراد کو بدلیں، فوج میں آپ کے تیار کردہ آدمی ہوں، عدلیہ میں۔ آپ کے تیار کردہ آدمی ہوں، مقننہ میں آپ کے تیار کردہ آدمی ہوں، بیوروکریسی میں آپ کے تیار کردہ آدمی ہوں۔ آپ کے ہم خیال اور آپ کے تیار کردہ عوام آپ کو ووٹ دیں۔ اس وقت تو پچھلے ۷۸ سال کی سیاسی جدوجہد سے آپ کی

ضمانتیں ضبط ہو رہی ہیں، عوام آپ کو ووٹ نہیں دیتے اور اگر آپ نے اپنا منہج اور طریق کار نہ بدلا، صرف امیر جماعت بدلتے رہے تو عوام آپ کو ووٹ دیں گے بھی نہیں۔

٭ اصول کی بات سمجھیے کہ ’نظام بدلو‘ کی حکمت عملی جو جماعت نے اختیار کی وہ ایک اجتہادی کوشش تھی جو قرآن وسنت کی روشنی میں کی گئی۔ اگر ایک طریقے سے آپ کا مسئلہ حل نہیں ہوا، تو دوسرے طریقے کا سوچیے، تیسرے طریقے کا سوچیے کیونکہ حکمت عملی منصوص نہیں ہوتی، وہ تو بدلتی رہتی ہے، بدل سکتی ہے، بدلی جاسکتی ہے اور بوقت ضرورت بدلی جانی چاہیے۔

٭ ہماری رائے یہ ہے کہ نظام کو بدلنے کے لیے ”صرف سیاسی جدوجہد“ پر انحصار نہ کیا جائے بلکہ فرد کو بدلنے کی کوشش بھی کی جائے، دعوت وتعلیم کے ذریعے، اصلاح اور تزکیۂ نفس کے ذریعے کیونکہ:

- اللہ تعالیٰ نے سارے انبیاء کو انہی کے ذریعے اشاعت اسلام اور اقامت دین کا طریقہ بتایا تھا۔[۱]

- قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے چار دفعہ[۲] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشاعت دین اور غلبۂ دین کا یہی طریقہ بتایا ہے اور آپ نے اس طریقے پر عمل کر کے کامیابی حاصل کی اور مدینہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

- لہٰذا جماعت کو بھی دعوت وتعلیم اور اصلاح وتزکیۂ نفس کے ذریعے افراد سازی پر محنت کرنی چاہیے اور لوگوں کے ذہن وقلب اور فکر وعمل کو بدلنے اور ان کی تعمیر شخصیت اور کردار سازی کے لیے پرانے اور نئے سارے ذرائع استعمال کرنے چاہئیں۔

- یہ طریقہ نہ صرف شرعی ہے بلکہ عقلی بھی ہے کیونکہ افراد کے سدھرنے سے معاشرہ بھی سدھرے گا کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور اس سے ریاست بھی عین اسلامی ہو جائے گی کیونکہ ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ رائے مولانا مودودیؒ کی ہے جو انہوں نے ۱۹۴۱ء میں پیش

---

[۱] طٰہٰ ۲۰: ۴۳: ۴۴، نوح ۷۱: ۵، مریم ۱۹: ۴۲، ۴۳، ۴۳، الاعلیٰ ۸۷: ۱۹، النازعات ۷۹: ۱۸

[۲] البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۲، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

کی۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے رائے بدل لی جب وہ رائے صحیح ثابت نہ ہوئی تو مولانا نے ۱۹۷۵ء میں اپنی رائے بدلی لیکن جماعت کی اس وقت کی قیادت بات کی گہرائی تک نہ پہنچ سکی اورانہوں نے مولانا کی بات ماننے سے معذرت کرلی[۱]۔ ۱۹۷۵ء سے لے کر آج ۲۰۲۵ء آ گیا یعنی ۵۰ سال/ نصف صدی گزر گئی۔ آپ ہر الیکشن میں ناکام ہوئے، آپ کی ضمانتیں ضبط ہوتی رہیں، یہاں تک کہ پارلیمنٹ سے آپ کا صفایا ہوگیا لیکن آپ مولانا مودودیؒ کی بات ماننے کو تیارنہیں اورصرف سیاسی جدوجہد کے ذریعے آپ نظام بدلنا چاہتے ہیں اورسیاسی نظام بھی وہ جو مغرب کی لادین اورسرمایہ دارانہ جمہوریت پر مبنی ہے (اس کو اسلام کا جوتڑ کہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ بے اثر رہی)۔

حدودقوانین جنرل ضیاء نے ۱۹۷۹ء میں بنائے تھے۔اس وقت بھی دستور کا حصہ ہیں۔ کیا آپ ان پرعمل کرواسکے ہیں؟ آپ آج تک نہیں کراسکےتو مستقبل میں ان پرعمل کیسے کرائیں گے؟ ہم کہتے ہیں کہ فرض کرو کہ آپ انتخابات جیت جائیں تو کیا پہلے سے موجود انتظامیہ کے ذریعے آپ حدود لازناً نافذ کراسکیں گے۔جس اسٹیبلشمنٹ نے ۷۰ فیصد نشستیں جیتی ہوئی تحریک انصاف کو اقتدارنہیں لینے دیا تو وہ آپ کو اقتدار لینے دے گی اور اگر آپ کو اقتدار مل جائے تو یہ فوج، یہ عدلیہ، یہ بیوروکریسی، یہ امریکہ، یہ یورپی یونین آپ کو پاکستان میں اسلام نافذ کرنے دیں گے؟

حقیقت یہی ہے، اگرچہ تلخ ہے، کہ آپ موجودہ نظام کے اندر رہتے ہوئے اورصرف سیاسی جدوجہد سے قیامت تک نہ اس نظام کو بدل سکتے ہیں اور نہ یہاں اسلامی نظام لا سکتے ہیں۔نعرے لگانا اور بدلی ہوئی جارحانہ حکمت عملی اختیار کرنے کا تاثر دینا، معاف کیجیے گا، ہر نئے امیر کی سیاسی مجبوری ہے،سوآپ یہ کھیل کھیلتے رہیےلیکن اس سے آپ موجودہ نظام کو بدل دیں گے یا اس کی جگہ اسلامی نظام لے آئیں گے،اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں۔

ہمارا کام حقائق آپ کےعلم میں لانا تھا، باقی فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے،اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اہل جماعت میری آراء پرتوجہ فرمائیں گے۔

---

[۱] حوالہ جات اس شمارے کے مضمون 'جماعت اسلامی کیسے کامیاب ہوسکتی ہے؟' میں موجود ہیں۔

جاوید انور {۱}

تعلیم و تربیت

۲۷ ویں ترمیم کی اصل حقیقت

اس ترمیم کا اصل مقصد فوجی آمریت کا آئینی تحفظ ہے

پاکستان کے آئین میں ۲۷ ویں ترمیم ایک ایسا موڑ ہے جو فوجی آمریت کو قانونی تحفظ فراہم کرتی ہے اور اسے سمجھنے کے لیے تاریخی، فوجی، عالمی اور علاقائی جیو پالیٹکس کا تناظر ضروری ہے۔ یہ مضمون امریکی سامراج کی جارحانہ پالیسیوں، افغانستان کی جنگوں، ضیاء الحق سے لے کر موجودہ دور تک کی فوجی مداخلتوں اور پاکستان کی سویلین حکومتوں کی کمزوریوں کا جائزہ لیتا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی "امن" کی باتیں جنگ کی حقیقتوں سے منافقانہ ہیں، جہاں اسرائیل، یوکرین اور جنوبی ایشیا کے محاذ امریکی مفادات کی نذر ہونے والے ہیں۔ پاکستان کی فوجی قیادت امریکا کی "خدمت گزاری" میں تاریخی طور پر ملوث رہی ہے، اور یہ ترمیم اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے یہ افغانستان پر نئے حملے کی تیاری ہے۔

پاکستان کے آئین میں 27 ویں ترمیم نے پاکستانی عدلیہ کو تو ڈھیر کر ہی دیا ہے اور اس پر بہت کچھ شائع ہو رہا ہے اور وکلاء اور میڈیا میں زیر بحث ہے۔ لیکن جس بات پر کم بات ہو رہی ہے وہ ملٹری ڈکٹیٹر شپ کو آئینی طور پر تسلیم کر لینا ہے۔ پاکستانی میڈیا اور صحافیوں میں فوج پر بات کرنے کی جرأت کم ہو گئی ہے۔ اب تنقید بھی ممکن نہیں رہی ہے۔

یہ بل جس سرعت کے ساتھ قومی اسمبلی اور سینیٹ سے پاس ہوا ہے، وہ دنیا کی پارلیمانی تاریخ کا عالمی ریکارڈ ہے۔ پاکستان میں حکومت اکثریت میں نہ بھی ہو تو کوئی بھی بل پاس کرانے کے لیے اپوزیشن سے ووٹ لیے جاتے ہیں، خواہ ڈراتے ہوئے، بندوق کے نوک پر، یا رویوں کی بوریوں سے، یا سب ایک ساتھ۔ اور یہ مرحلہ ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں پاکستانیوں کی حکومت کبھی نہیں رہی ہے۔ اس کا سرا بہت دور، بہت دور، سات سمندر پار سے ہے۔

{۱} "السیرہ" کینیڈا

اس بل نے ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ لنچ کرنے والے فیلڈ مارشل عاصم منیر صاحب کی طاقت کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اور فوجی آمریت کو آئینی تحفظ مل گیا ہے۔ اب فوج کو مارشل لاء لگانے اور آئین معطل کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اب ترمیم شدہ آئین کے تحت مارشل لاء کے فرمان جاری ہو سکتے ہیں۔ مقننہ اور عدلیہ اسے چیلنج نہیں کر سکتی۔ اب عملاً پاکستان کے تمام ادارے فیلڈ مارشل کے زیر نگرانی ہو جائیں گے۔ یہ ترمیم فوجی قیادت، خاص طور پر آرمی چیف فیلڈ مارشل عاصم منیر صاحب کی طاقتوں کو مزید وسعت دیتی ہے اور فوج کو آئینی طور پر سب پر برتری حاصل ہو چکی ہے۔ یہ قانون 27 نومبر 2025 سے نافذ العمل ہو جائے گا۔ ذیل میں فوجی نظام میں اہم تبدیلیوں کا خلاصہ دے رہا ہوں، جو آرٹیکل 243 اور متعلقہ شقوں میں کی گئی ہیں:

* چیف آف ڈیفنس فورسز (CDF) کا نیا عہدہ: آرمی چیف کو آئینی طور پر چیف آف ڈیفنس فورسز کا عہدہ دیا گیا ہے، جو آرمی، نیوی اور ایئر فورس پر براہ راست کمانڈ کرے گا۔ یہ فوجی کمانڈ کو مرکزی بناتا ہے اور آرمی کی برتری کو یقینی بناتا ہے۔

* جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی (CJCSC) کا خاتمہ: اس عہدے کو ختم کر دیا گیا ہے، جو فوجی برانچز کے درمیان توازن ختم کر دیتا ہے اور آرمی (بری فوج) کو بالادست کرتا ہے۔ موجودہ چیئرمین جنرل ساحر شمشاد مرزا کی ریٹائرمنٹ (نومبر 2025) کے ساتھ یہ ختم ہو جائے گا۔

* نیشنل سٹریٹجک کمانڈ (NSC) کا نیا کمانڈر: ایٹمی پروگرام کی نگرانی کے لیے NSC کا کمانڈر صرف پاک فوج (آرمی) سے مقرر ہوگا، جو CDF کی سفارش پر وزیر اعظم کی طرف سے تعینات کیا جائے گا۔ یہ ایٹمی کمانڈ کو آرمی کے ماتحت کر دیتا ہے۔

* فائیو سٹار رینک کو لائف ٹائم امیونٹی اور مراعات: فیلڈ مارشل، مارشل آف ایئر فورس، اور ایڈمرل آف فلیٹ جیسے اعزازی رینکس کو لائف ٹائم حیثیت دی گئی ہے، جن میں جرائم کی کارروائی سے مکمل تحفظ، لائف ٹائم یونیفارم اور مراعات شامل ہیں۔ ان کی برطرفی کے لیے پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت درکار ہوگی۔ آرمی چیف عاصم منیر فیلڈ مارشل ہیں (اور یہ دو تہائی والی سویلین حکومت کو فوج کبھی بننے ہی نہیں دے گی)۔

* آرمی چیف کی مدتِ ملازمت میں توسیع: آرمی چیف (اب CDF) کی مدت 5 سال تک بڑھادی گئی ہے۔ یہ مدت 27 نومبر سے شروع ہوگی۔ اوراس مدت میں مزید اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تبدیلیاں مجموعی طور پرفوجی نظام کوآرمی پر مبنی اورمرکزی بناتی ہیں جس سے سول ملٹری توازن پوری طرح سے بری فوج کی طرف جھک گیا ہے۔

واضح رہے کہ جدید جنگوں میں بری فوج کا کردار بہت سکڑ چکا ہے۔ اب جنگ فضائی اور بحری طاقت سے لڑی جاتی ہے۔ اب جنگ کا حوزہ (domain) بدل گیا ہے۔ اب جنگ برقی مقناطیسی طیف (Electromagnetic spectrum) میں لڑی جاتی ہے۔ اب جنگ الیکٹرانک (Electronic warfare) ہے، جاسوسی بھی اب صوتی (Sound spying) اور شعاعی (Rays spying) ہے۔ اب جنگ مجازی حوزہ (Virtual domain) میں لڑی جاتی ہے۔ یعنی سائبر اسپیس (cyber warfare)، ورچوئل نیٹ ورکس، انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ماحول کی جنگ ہے، جس میں روایتی ہتھیاروں کے بجائے سائبر حملوں، ہیکنگ، معلوماتی جنگ (information warfare)، مصنوعی ذہانت (AI) پر مبنی ورچوئل حملوں کی شکل میں لڑی جاتی ہے، جہاں دشمن کے ڈیجیٹل نظاموں کونشانہ بنایا جاتا ہے بغیر جسمانی سرحدوں کے پار ہونے کی ضرورت کے۔

2019 میں بھارت پاکستان جھڑپ میں پاکستانی فضائیہ کے ایک شاہین نے انڈین جہاز گرائے اور 2025 میں بھی پاکستان فضائیہ کے شاہینوں نے ہی کئی جہاز گرا کر پاکستان کا عالمی قد بڑھایا ہے۔ پاک فضائیہ کے پائلٹ کی ٹریننگ چین میں ہوئی ہے جو بہت اچھی ہوئی ہے۔ جنگ کے نئے حوزہ (Domains) میں پاک فضائیہ اور بحریہ کی صلاحیت اچھی ہے۔

اس سال مئی میں بھارت کی چار روزہ جنگ میں پاک فضائیہ کے ایک افسر نے عالمی میڈیا کے سامنے جو بریفنگ دی، اس سے دنیا کو پاکستان کی فضائی صلاحیت کا پورا یقین ہو گیا۔ فیلڈ مارشل عاصم منیر صاحب نے اپنے کو چیف آف ڈیفنس فورسز (CDF) بنا کر اندرون فوج بھی طاقت کا توازن بگاڑ دیا ہے۔ اس سے پاک فوج کا ڈسپلن متاثر ہوگا۔ جنگ لڑے گی فضائیہ اور بحریہ، اور اسٹارز لگیں گے بری فوج کے جنرلوں کو۔ کیا یہ انصاف ہے؟ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ٦١)

پاکستانیات خالد مسعود خان

پاکستان میں حالات مثبت رُخ اختیار کرتے نظر نہیں آتے مگر

لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

گزشتہ ہفتے 'روزنامہ دنیا' میں شائع ہونے والی ایک خبر نے، جو بظاہر ایک شادی شدہ جوڑے کے درمیان 25 سالہ ازدواجی رفاقت کے نہایت معمولی سی بات کے باعث ختم ہونے کے بارے میں تھی، میری توجہ کھینچ لی۔ امریکہ میں ہونے والی اس طلاق میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ وہاں تو اس سے بھی کہیں معمولی بات پر طلاق کی نوبت آجاتی ہے، تاہم اس خبر نے جو امریکہ کے معاشرتی حوالے سے شاید معمول کی بات تھی، میرے لیے ذرا مختلف قسم کا تاثر چھوڑا ہے۔ پہلے اس خبر کی تفصیل ہوجائے۔

خبر یوں ہے کہ ایک خاتون نے شادی کے 25 سال بعد اپنے شوہر سے اس بنا پر طلاق لے لی کہ اس نے شادی کی پچیسویں سالگرہ پر منگوائے جانے والے کیک میں سے اپنی اہلیہ کے حصے کا بچ جانے والا کیک کا آخری ٹکڑا کھا لیا تھا۔ ہوا یوں کہ جوڑے نے اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ پر کسی ریستوران میں ڈنر کرنے کا پروگرام بنایا۔ 46 سالہ خاتون نے بتایا کہ اس کا اپنے 48 سالہ شوہر کے ساتھ اکثر جھگڑا رہتا تھا۔ اس کے شوہر نے شادی کی سالگرہ پر باہمی جھگڑے کو ختم کرنے کی خاطر ڈنر پلان کیا، تاہم اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اسی ہوٹل کا انتخاب کیا جس کے حوالے سے ہم نے سوچا ہوا تھا کہ ہم یہاں کبھی نہیں جائیں گے۔ خاتون نے بتایا کہ اس ناپسندیدہ اور نامعقول انتخاب کے باوجود اس نے اپنا موڈ ٹھیک رکھا لیکن جیسے ہی وہ ہوٹل پہنچے اس کے شوہر کا موڈ بگڑ گیا، اس نے مجھے رات کے کھانے کا آرڈر دینے کا کہا تو میں نے تین ڈشز منتخب کر کے اسے بتائیں اور میٹھے میں ان دونوں نے پنیر (Cheez) کیک آرڈر کیا۔

خاتون کا کہنا تھا کہ چونکہ کھانا کھانے کے بعد مزید کھانے کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا وہ اپنے کیک کا ٹکڑا اپنے ساتھ گھر لے آئی جبکہ اس کے شوہر نے اپنے حصے کا کیک وہیں ریستوران میں کھا لیا۔ گھر آکر اس نے اپنا کیک اس خیال سے فریج میں رکھ دیا کہ وہ صبح اٹھ کر اپنا کیک

کھالے گی مگر جب اگلی صبح اٹھ کر اس نے رات کا بچا ہوا کیک کھانے کا سوچ کر فریج کھولا تو اس نے دیکھا کہ اس کا رکھا ہوا کیک ختم ہو چکا ہے اور فریج میں محض اس کی باقیات بچی ہوئی ہیں۔ اس نے جب اپنے شوہر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے پہلے تو یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ اس نے اس کا بچا ہوا کیک کھایا ہے مگر بعد میں تسلیم کرلیا کہ اس نے میرا کیک کھالیا۔

خاتون کے مطابق اس وقت اسے احساس ہوا کہ اس 25 سالہ ازدواجی زندگی میں اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ اس کے حصے کا کیک ہمیشہ اس کا شوہر کھالیتا ہے۔ یہ صرف کیک کی بات نہیں ہے بلکہ زندگی کی چھوٹی بڑی چیزوں میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اس کو لگا کہ وہ صرف اس کا گھر سنبھالنے کے لیے ہے، اس کا کام محض اپنے شوہر کی خاطر مدارت کرنا، اس کا دھیان رکھنا اور اس کے کام وقت پر سرانجام دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں جبکہ بدلے میں اسے اپنے شوہر کا بچا کھچا کھانا ملتا ہے۔

ممکن ہے قارئین کے لیے اس خبر میں بظاہر کوئی خاص بات نہ ہو اور وہ اس خبر پر میری خصوصی توجہ کو اپنے وقت اور اس ساری تفصیل کو کالم کے لیے مخصوص صفحے کا ضیاع سمجھیں لیکن میرے پیشِ نظر اس خبر میں پوشیدہ ایک مسلسل استحصالی رویے سے تنگ آئی ہوئی ایک خاتون کی بغاوت کے تناظر میں اس سے کہیں وسیع تر منظرنامے کا خیال ہے۔ مجھے اس خاتون کی شخصی آزادی پر، بھلے وہ اسے پچیس سال بعد ہی کیوں نہ نصیب ہوئی، حسرت ہوئی۔ ہم نے گزشتہ 78 سال رہزنوں کو اپنا رہنما بناتے ہوئے، صاحبانِ اقتدار کے نخرے برداشت کرتے ہوئے، خود پر مسلط اشرافیہ کے چاؤ چونچلے اٹھاتے ہوئے، زور آوروں کی ہدایات پر چلتے ہوئے، بیوروکریسی کو پالتے پوستے ہوئے، آمروں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے، جمہوریت پر شب خون مارنے والوں سے ڈرتے ہوئے، اپنے جائز حق کے حصول کے لیے ذلیل ہوتے ہوئے، لٹیروں کو اپنے سروں پر بٹھاتے ہوئے، اپنے سیاسی لیڈروں کو خطا کاروں سے دیوتا بناتے ہوئے، اپنے لیڈروں کے گمراہ کن سیاسی نظریات کو ایمان کا درجہ دیتے ہوئے، ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتتے ہوئے، آئین میں حاصل حقوق کے لیے حسرت کرتے ہوئے، مافیاؤں سے لٹتے پٹتے ہوئے، انصاف کی آرزو میں عدالتوں سے ناکام و نامراد لوٹتے ہوئے، ظالموں سے تحفظ کی تگ و دو میں تھانوں میں ذلیل و خوار ہوتے ہوئے، مراعات یافتہ طبقوں کو اپنے

حصے کا کیک کھلاتے ہوئے اور طاقتوروں کے لیے غلامی کرتے ہوئے گزار دیے ہیں۔

ہمارا یہ حال ہے کہ گزشتہ 78 سال سے ہم روزانہ صبح اٹھ کر اپنا رات کو بمشکل بچا کر رکھا ہوا کیک فریج سے نکال کر کھانے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ رات کو ہمارے کیک کا میسر آخری ٹکڑا وہی لوگ فریج سے نکال کر کھا گئے ہیں جنہوں نے رات اپنے حصے سے کہیں بڑھ کر کیک ہضم کر لیا تھا۔ امریکہ میں اپنے کیک کا حصہ ہڑپ کرنے پر 25 سال بعد ہی سہی، طلاق لینے والی وہ خاتون بہرحال ہماری نسبت کہیں خوش قسمت تھی کہ چوتھائی صدی میں ہی اس کی اس نظامِ جبر سے خلاصی ہو گئی مگر ہمیں پون صدی سے بھی تین زائد سال اس استحصالِ مسلسل کی چکی میں پسنے کے بعد بھی یہ حق نہیں ملا کہ ہم بھی کسی کو طلاق دے سکتے یا خلع کے حصول میں کامیاب ہو جاتے۔ ہمارے پاس اس نظام کے بارے میں مزید دو بری خبریں ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے پاس فی الوقت اس تعفن زدہ سے نظام چھٹکارے کی کوئی سبیل ممکن نہیں اور دوسری خبر جو پہلی خبر سے بھی بدتر ہے وہ یہ کہ اس میں دور دور تک کسی قسم کی جوہری تبدیلی کا امکان بھی دکھائی نہیں دے رہا۔

تبدیلی کے کچھ Indicators یعنی اشارے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا اشارہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہمارا آج ہمارے گزرے ہوئے کل سے بہتر ہو۔ امام بیہقی ایک حدیث مبارکہ روایت کرتے ہیں کہ جس شخص کے دو دن برابر ہوں وہ گھاٹے میں ہے، اور جس کا آج اس کے گزشتہ کل سے بدتر ہو وہ محروم (یا برباد) ہے،،۔ ادھر صورتحال یہ ہے کہ ہمارا آج ہمارے گزشتہ کل سے بہتر ہونا تو دور رہا، یہ گزشتہ کل کے برابر بھی نہیں جس میں گھاٹے کی بدخبری سنائی گئی ہے۔ ہمارا ہر گزرتا دن پہلے گزرے ہوئے دن سے خراب تر گزر رہا ہے تو بھلا ایسے میں بہتری کا امکان کیسے دکھائی دے سکتا ہے؟

مَیں اپنے بچپن والے ملتان کا موازنہ لڑکپن والے ملتان سے اور جوانی والے ملتان کا موازنہ اس بڑھاپے کی طرف تیزی سے گامزن عمر والے آج کے ملتان سے کرتا ہوں تو کئی گنا آبادی اور اس کے نتیجے میں بے طرح پھیلے ہوئے اس شہر کی تقریباً ہر چیز مائل بہ زوال ہے۔

(بقیہ صفحہ نمبر: ۴۶)

اسلام اور مغرب حافظ محمد عمران طحاوی

ملوکیت بھری جمہوریت زوال پذیر ہے

انسانی تاریخ کا سب سے بنیادی سوال یہ رہا ہے کہ اقتدار اور اختیار کیا ہے؟ کن ہاتھوں میں ہونا چاہیے؟ اور ریاست انسان کو کیا دیتی ہے۔ آزادی یا غلامی؟ جمہوریت کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ جمہوریت نے عوامی اقتدار کا وعدہ ضرور کیا۔ مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

جمہوریت میں اعلان تو یہ کیا جاتا ہے کہ یہاں عوام کی حکومت ہوتی ہے، عوام کو تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ عوامی نمائندے بھی عموماً عوام کی بجائے خواص کے خدمتگار ہوتے ہیں۔ انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ، عالمی مالیاتی ادارے، طاغوتی قوتیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان عوامی نمائندوں کو استعمال کرتی ہیں اور یہ جمہوری نمائندے عوام پر ہر طرح کے بوجھ لادتے ہیں فرعون و قارون اور ہامان کا ٹرائیکا آج بھی سرپیکار ہے۔ یہ تمام لادینی نظام انسانی فلاح و بہبود کے لیے نہیں بلکہ اپنے مغربی آقاؤں کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ استعمار چالاکی سے کام کر رہا ہے اور عوام سہانے خوابوں کے مزے لے رہے ہیں۔

ملوکیت نے حکمران کو تقدس دیا اور ہر سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ عوام کے انسانی حقوق صلب کر لیے گئے۔ حق بولنے والوں کی زبان کھینچ کر انہیں نشان عبرت بنا دیا۔ برسر اقتدار بندے کو خدائی اختیارات حاصل ہوتے گئے تاہم خدا ہر ایک کا علاج ضرور کرتا ہے۔

ہر فرعونے را موسیٰ و ہر نمرود را پشہ

(یعنی ہر فرعون کے لیے موسیٰ اور نمرود کے لیے مچھر ہوتا ہے)

تاریخ شاہد ہے کہ آسمانی ہدایات سے مملو صرف خلافت ہی وہ واحد نظام تھا جس میں انسان کو حقیقی عزت، عدالت اور آزادی ملی۔

آج دنیا ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں جمہوریت اپنے ہی بوجھ سے ٹوٹ رہی ہے اور ملوکیت نئی شکلوں، کارپوریٹ اولیگارکی، ڈیجیٹل نگرانی، طبقہ امرا کی حکومت، خاندانی

سیاست اور ریاستی استبداد کی صورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

جمہوریت: تصور اور زوال

جمہوریت عوام کی حکمرانی، اختیار کی تقسیم، اور قانون کی بالادستی کا اعلان تو ہے۔ مگر عملی دنیا میں یہ عنقا ہو چکا ہے آج سیاست منافقت کا روپ دھار چکی ہے، جو جتنا لفاظی کا ماہر ہے وہ اتنا بڑا سیاست دان۔ فرید زکریا کی Illiberal Democracy، لیری ڈائمنڈ کی Electoral Authoritarianism، اور لیویسکی و زیبلات کی How Democracies Die میں یہ سب کہتے ہیں کہ جمہوریت اب جمہوریت نہیں رہی۔ کارپوریٹ سرمایہ انتخابات کنٹرول کرتا ہے، میڈیا عوامی رائے بناتا نہیں، اس سے مرضی کی رائے بنوائی جاتی ہے، سیاست چند خاندانوں کی ملکیت بن چکی ہے، سوشل میڈیا الگورتھم عوامی سوچ کو 'ڈیزائن' کر رہے ہیں۔ اقبال نے اس حقیقت کو ایک شعر میں سمیٹتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس
میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

گویا جمہوریت وہ نظام ہے جس میں انسان اپنا وزن کھو دیتا ہے تولنے لائق ہی نہیں رہتا commodity بن جاتا ہے۔

ملوکیت اقتدار و اختیار کی وراثت

ملوکیت میں حاکم قانون سے بلند ہوتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اسے استثنا حاصل ہوتا ہے جبکہ رعایا کمزور رکھی جاتی ہے۔ مختلف طرح کے ٹیکسز لگائے جاتے ہیں کہ عوام سر اٹھانے کے لائق نہ رہیں۔ اقتدار نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ نظامِ ملوکیت ہر دور میں دنیا کے ہر خطے میں کسی نہ کسی لبادے میں موجود رہا ہے۔

'جدید ملوکیت'

آج ملوکیت صرف بادشاہت نہیں رہی بلکہ بہت سارے بادشاہوں نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ عوام کالانعام پر حکومت کرنے پر ونڈ کھاؤ، کھنڈ کھاؤ۔

اب اسٹیبلشمنٹ کی حکمرانی بھی ہے، سرمایہ دار بھی اپنا حصہ بٹور رہا ہے کیونکہ اس نے اس نظام کے لانے میں سرمایہ کاری کی تھی، ٹیکنالوجی کمپنیوں کی ''ڈیٹا بادشاہت'' اپنے گل کھا رہی ہے اور خاندانی جمہوریت بھی پنپ رہی ہے۔

مغربی مفکرین Zuboff, Levitsky, Huntington سب اسے ''Neomonarchism'' کہتے ہیں یعنی ''شکل جمہوریت کی ہوگی جبکہ روح ملوکیت والی۔

خلافت: اخلاقی وقانونی ماڈل

خلافت کے نظام میں اقتدار امانت ہوتی ہے اور شریعت سپرلا۔ حاکم بھی قانون کے آگے جواب دہ ہوتا ہے اور اسے کوئی استثنا حاصل نہیں ہوتا۔ شوریٰ فیصلہ سازی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ کوئی اوپر سے فیصلہ نہیں تھونپتا۔ رعایا کو عدل، مذہبی آزادی، معاشی تحفظ اور امن مہیا کیا جاتا ہے۔

ابن خلدون لکھتے ہیں "الخلافة حملُ الكافةِ على مقتضي النظرِ الشرعی"

خلافت وہ نظام ہے جو حکمرانی کو اخلاقی وشرعی بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ خلافت میں احتساب وقت کے خلیفہ کا بھی ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے بھرے مجمع میں کپڑے کا حساب مانگا گیا لیکن آپ نے برا نہیں مانا بلکہ اپنے بیٹے عبداللہ ابن عمرؓ کو جواب دینے کو کہا۔ حضرت علیؓ اپنے دور خلافت میں ایک یہودی کے مقابل عدالت میں گواہ پیش نہ کر سکے تو اس وقت قاضی شریح نے فیصلہ خلیفہ کے خلاف دیا جس کو آپ نے قبول کیا۔

مذہبی آزادی

اسی اسلامی نظام کی وسعت ظرفی تھی کہ جہاں اقلیتوں کو بھی تمام حقوق دیے گئے، عہد نامۂ ایلیاء لکھا گیا، اقلیتوں کے معابد اور گرجا گھر محفوظ تھے۔

Will Durant نے اعتراف کیا ہے کہ ''مسلمان حکمرانوں نے اقلیتوں کو وہ تحفظ دیا جو انہیں اپنی ریاستوں میں بھی میسر نہ تھا۔''

معاشی عدل

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔ اقبال اسی نایاب نظام

کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا کبھی حمیتِ شاہین
جو پاسِ کہن نہ دے، وہ سلطنت نہیں ہوتی

انسانی شرف اور آزادی کا حقیقی مفہوم

رُبعی بن عامرؓ جب رستم کے دربار میں گھوڑے سمیت بے خوف وخطر داخل ہوئے تو رستم نے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟

ربعی بن عامر نے جو کہا وہ تاریخ میں سنہرے حروف میں درج ہے:

نَحْنُ عِبَادُ اللهِ، جِئْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللهِ،

وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ.[1]

"ہم اللہ کے بندے ہیں۔ ہم اس لیے آئے ہیں کہ بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت میں لائیں اور باطل مذاہب کے ظلم سے نکال کر اسلام کے عدل میں داخل کریں۔"

یہ وہ جملہ ہے جس نے دنیا کی سیاسی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ یہ اعلان مساوات تھا کہ کوئی انسان کسی انسان کا غلام نہیں۔ دنیا کے تمام نظام انسان کو قوم کا شہری ہر ریاست کا پرزہ یا کسی طبقے کا ماتحت غلام بنا دیتے ہیں جبکہ اسلام واحد نظام ہے جس میں انسان اللہ کا بندہ ہے، قانون سب کے لیے برابر ہے، عدل کو فوقیت ہے اور ہر طرح کا اختیار امانت ہے۔

قومی دولت اور وسائل پر رعایا کا حق ہے اور حکمران خادم ہے 'سید القوم خادمھم'۔ اس لیے دکھوں میں بلکتی انسانیت کے لیے اسلام میں ہی سلامتی ہے کیونکہ اسلام انسان کو اُس مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ خالق کا بندہ اور زمین کا خلیفہ بنتا ہے۔ زمین کے نام نہاد خداؤں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

---

[1] الطبری، تاریخ الامم والملوک

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

اسلام انسان کی وہ تمام زنجیریں توڑ دیتا ہے جن میں یہ جکڑا ہوا ہے۔ اسلام فلاحِ انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ اسلام غریب یعنی اجنبی ہو کر شروع ہوا لیکن آخر زمانہ میں پوری زمین پر غالب ہو جائے گا: "لا یبقی بیت مدر ولا وبر إلا أدخله الله هذا الدین"[۱]

زمین کی ہر جھونپڑی اور ہر مکان میں اسلام داخل ہو کر رہے گا۔

یہ اس لیے ہوگا کہ انسان ہر جھوٹے نظام کو آزمالے گا۔ جمہوریت (Democracy)، قومیت (Nationalism)، سرمایہ داری (Capitalism)، اشتراکیت (communism)، لبرلزم (Libralism) اور آخر میں انہی حقیقتوں پر لوٹ آئے گا جو فطرت نے مقدر کی ہیں۔ دنیا آج ہر باطل نظریے سے مایوس ہو چکی ہے اور صرف ایک سوال باقی رہ گیا ہے کہ انسان کو عزت اور شرف کون دیتا ہے؟ جواب قرآن نے دیا: "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" ہم نے بنی آدم کو عزت دی۔ انسانی عزت و احترام کا عملی نمونہ صرف اسلام دیتا ہے۔

دنیا بھر کی سیاسی سوچ آج اس حقیقت پر متفق ہوتی جا رہی ہے کہ موجودہ جمہوریت ''عوام کی حکمرانی'' نہیں رہی؛ یہ سرمایہ دار طبقات، ریاستی طاقتوں اور ڈیجیٹل نظاموں کی مشترکہ ملوکیت بن چکی ہے۔

اکثر مغربی سیاسی نظریہ ساز یعنی Farid Zakaria، Huntington، Levitsky اور Zuboff یہ اعلان کر چکے ہیں کہ دنیا جمہوریت کے نام پر ملوکیت میں داخل ہو چکی ہے۔ ایسے دور میں انسان کی نجات کسی نئے فلسفے، کسی نیشنل ازم یا کسی ٹیکنالوجی میں نہیں بلکہ اسی نظام میں ہے جس میں انسان خالق کا بندہ اور زمین کا خلیفہ بنتا ہے۔ یہی نظام ہے جو ہر طرح کی طاقت واقتدار کو امانت بناتا ہے، حکمران کو قانون کے تابع کرتا ہے، اسے کسی طرح کا استثناء نہیں دیتا۔ انسان کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرتا ہے اور معاشرے کو عدل کی بنیاد پر کھڑا کرتا

[۱] مسند احمد

ہے کیونکہ دین ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو شیطان بننے سے روکتا ہے ورنہ اقتدار و اختیار خدا کے انکار اور خدائی کے دعوے تک لے جاتے ہیں اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دِیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلامی نظام ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کو مخلوق کی غلامی سے نکال کر خالق کی عطاء کردہ آزادی میں داخل کرتا ہے، اسلام ہی ہے جس کی طرف آخر زمانہ میں پوری دنیا لوٹنے میں عافیت سمجھے گی۔ یہی سچائی کا آخری، کامل اور تاریخ میں آزمودہ نمونہ ہے۔ "اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ۔"

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

بقیہ: لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

ٹریفک کی صورتحال، سرکاری اداروں کی کارکردگی، کام کروانے کے لیے اوپر والے خرچے کی شرح، قانون کی حاکمیت، تھانہ کچہری اور پٹوار کا حال، ملک میں جمہوری اقدار اور اخلاقیات کی صورتحال، غرض ہر میدان میں پہلے سے زیادہ گند مچا ہوا ہے اور زیادہ دھول اڑ رہی ہے۔ ملتان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دراصل پاکستان کے ہر شہر کی کہانی ہے اور میری آہ و زاری ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔

ہم مجبور اور مقہور لوگ کیا کریں؟ کس سے طلاق لے کر اپنے گلے کے طوق سے نجات حاصل کریں؟ کس سے اپنے حقوق کا تقاضا کریں؟ ہمیں بیک وقت کئی قسم کے مسائل کا سامنا ہے۔ ہمیں فی الوقت اس جبرِ مسلسل سے چھٹکارے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہم اُس امریکی خاتون کی طرح طلاق جیسی نعمت سے بھی محروم ہیں اور گھر چھوڑ کر بھاگنا بھی نہیں ہے۔ ہم ایک بے نتیجہ جنگ کے سپاہی ہیں مگر مایوس نہیں، بقول فیض:

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

غامدیت

مولانا مفتی منیب الرحمٰن

تجدد خلافِ اسلام ہے

سرسید سے لے کر غامدی تک تحریک تجدد کا ایک تنقیدی مطالعہ

تجدد کیا ہے؟

دین میں تَجَدُّد کا مطلب ہے: ''اصل دین اور اسلام کے مسلّمہ ومتفقہ علمی اور فقہی اُصول وضوابط کو چھوڑ کر اُس کے احکام وقوانین کی ایسی نئی تعبیر وتشریح کرنا جو دین کی اصل روح کے منافی ہو، بلکہ بعض صورتوں میں اس کی ضد ہو''۔ چونکہ تَجَدُّد کے لفظی معنیٰ میں تکلُّف وتصنُّع پایا جاتا ہے، سو اس عمل کے لیے یہ لفظ زیادہ موزوں سمجھا گیا ہے کہ اس کی حیثیت ''بے جا تکلّف'' سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی اور اس قسم کی جدت پیدا کرنے والے کو ''مُتَجَدِّد'' کہا جاتا ہے۔

خیر خواہی کا بہانہ

ہر زمانے میں ایک ایسا تَجَدُّد پسند طبقہ موجود رہا ہے جو خدمتِ دین کے نام پر دین کی نِت نئی تعبیرات وتشریحات پیش کرتا ہے، وہ ماضی کے مسلّمہ علمی وفقہی اُصولوں سے انحراف کر کے نئے خود ساختہ اصول وضع کرتا ہے اور اُمت میں اپنی فکری بدعات کو اس انداز میں متعارف کراتا ہے کہ اس کا ایک پہلو دین سے بھی جڑا نظر آئے، لیکن ساتھ ہی وہ روایتی دین سے جدا بھی نظر آئے، یعنی دین کی ایسی تعبیر وتشریح کہ جس میں جدّت اور نیا پن بلکہ کسی حد تک انوکھا پن ہو، الغرض دین کے بارے میں ایسی وارداتیں کرنے والے خیر خواہ کے روپ میں وار کرتے ہیں۔ شیطان کا طریقہ بھی یہی رہا ہے، اُس نے حضرت آدم وحوا کو جب بہکانا چاہا تو قرآنِ کریم میں ہے: ''وہ قسمیں کھا کر آدم وحوا کو باور کراتا رہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں'' (الاعراف:21)۔ پس دین میں بگاڑ پیدا کرنے والا یہ طبقہ بھی مصلح اور خیر خواہ کے روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ دین کی وہ تعبیر وتشریح کی جائے جو مغرب کے لیے کسی درجے میں قابلِ قبول ہو، پس یہ روش مسلمانوں سے رسوخ فی العلم اور تَصَلُّبْ فِی الدِّیْن کی خوبی کو سلب کر کے دین کو لچکدار بنانے کا نام ہے کہ اُسے جدھر چاہیں، موڑ دیں اور جس تعبیر کا لبادہ پہنانا چاہیں، پہنا دیں۔

انکارِ سنت

اس ڈگر پر چلنے والی تجدُّد کی خواہ قدیم تحریکیں ہوں (جیسے خوارج اور مُعتزلہ) یا عصر حاضر کی جدید تحریکیں ہوں، ان کا پہلا نشانہ سنت وحدیث بنتی ہیں۔ پس سنت وحدیث ہی قرآنی فکر کو تفصیلی عملی ڈھانچہ فراہم کرتی ہیں اور دین کو اپنی منشا کے مطابق ڈھالنے میں انحرافی و الحادی تحریکوں کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ لہٰذا قرآن اور دین کی من پسند تفسیر وتاویل اور اسے جدید افکار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ان متجدِّدِین حضرات کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ درمیان میں سے سنت وحدیث کا کانٹا نکال دیا جائے۔ یہ وہی مرض ہے جس کی تشخیص حضرت عمرؓ بن خطاب نے ان الفاظ میں کی ہے: ''عقل پرست لوگ سنت کے دشمن ہوتے ہیں، وہ احادیث کو یاد نہیں رکھ سکتے اور ان احادیث کی فہم اور ان کا استحضار ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ پس جب صورتحال یہ ہو اور ان سے دین کے بارے میں سوالات کیے جائیں تو اُنہیں ''میں نہیں جانتا'' کہنے میں عار محسوس ہوتا ہے، لہٰذا یہ لوگ فہمِ دین میں سنت کے بجائے اپنی عقل کو ہی معیار بنا لیتے ہیں'' (جَامِعُ بَیانِ الْعِلْمِ وَفَضْلِهٖ: 2001)۔ متجدِّدین کا طبقہ مسلمانوں کے ردِّعمل سے بچنے کے لیے حدیث وسنّت کا مطلق انکار تو نہیں کرتا، لیکن حجّیتِ حدیث کی نفی کر دیتا ہے، جب حُجّیتِ حدیث کی نفی کر دی جائے تو آیاتِ قرآنی کی مَن مانی تاویلات وتوجیہات کرنے کا راستہ کھل جاتا ہے۔

حدیث پاک میں ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان سے علم کو یونہی نہیں اٹھا لیتا (کہ غبارے کی شکل میں اڑتا ہوا نظر آئے)، بلکہ جب علمائے حق کو اٹھا لیا جاتا ہے تو اُن کے ساتھ علمِ حق بھی اٹھ جاتا ہے حتیٰ کہ جب کوئی عالم باقی نہ رہے تو لوگ جاہلوں کو اپنا (دینی) سربراہ بنا لیتے ہیں، پھر جب اُن سے مسائل پوچھے جاتے ہیں تو وہ (اپنے جہل کا اعتراف کرنے کی بجائے) جہالت پر مبنی فتوے دیتے ہیں، پس وہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں'' (بخاری: 100)۔

تجدد پسندی کا جواز

اُمت میں تجدُّد پسندی کے رجحان کو جواز فراہم کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں: کبھی دین کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر، کبھی نئی نسل کے

ذہنوں میں پائے جانے والے شبہات کے ازالے کے نام پر اور کبھی اسلام کے دفاع کے نام پر تجدُّد پسندی کی راہ اختیار کی جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقی دفاع تو یہ ہے کہ دین اور نصوصِ قرآن وحدیث کو عقل ونقل سے درست ثابت کیا جائے، جبکہ متجدِ دین اصل دین سے ہٹ کر نصوصِ قرآن کی ایسی من پسند تعبیرات کرتے ہیں جو آزاد خیال لوگوں کے نزدیک قابلِ قبول ہوں، وہ متصلِّب وراسخ العقیدہ دینداروں کو غالب کے اس شعر کا مصداق قرار دیتے ہیں:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

مفہومی ترجمہ: یہ گزرے زمانے کے لوگ ہیں، ان سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں، یہ تو وہ لوگ ہیں جو (خوشی کے اسباب) یعنی شراب وموسیقی کو بھی غم کے اسباب سمجھتے ہیں۔ اِن متجدّ دِین حضرات کے لیے تجدُّد پسندی کے نام پر اپنے نت نئے افکار کو کسی طرح کی سندِ جواز فراہم کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ کتاب وسنت اور اُن سے استنباط واستدلال کا جو طریقہ علمائے اُمت کا امتیاز اور خاصّہ رہا ہے، اس سے ان تجدُّد پسندوں کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ قرآن وسنت کی استنادی حیثیت اور اُصولِ فقہ واُصولِ حدیث جیسے علوم آلیہ سے عام طور پر انہیں کچھ لینا دینا نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے اکثر کی عربی زبان سے واقفیت بھی عموماً واجبی سی ہوتی ہے۔ وہ اکثر خودساختہ تخیُّلاتی پیمانوں کی مدد سے تفہیم دین کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ حضرات اپنے اپنے افکار کو اسلامیانے اور ان پر دین کا رنگ چڑھانے کے لیے تجدیدِ دین کے سائبان میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔ گویا تجدید کے اصل کلمے یالفظِ جدید سے ان حضرات نے یہ معنی سمجھا ہے کہ ہر دور میں اسلام کی ایک نئی تعبیر اور تشریح ہوگی۔ الغرض تجدیدِ دین کا یہ مفہوم لینا غلط ہے کہ دین میں جدت کی گنجائش موجود ہے، حالانکہ تجدُّد پسندی اپنی حقیقت اور اثرات کے اعتبار سے تجدید کی ضد ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

فکری بدعت اور دین کو باطل افکار اور خواہشات کے تابع بنانے کا نام تجدُّد ہے، جبکہ اصلِ دین کی طرف لوٹنے اور دین کو اپنی اصل شکل میں پیش کرنے اور فعاّل بنانے کا نام تجدید ہے۔

تجدُّد پسندوں کا گروہ ایک طرف تو اپنی تجدد پسندی کو تجدید کا نام دے کر سندِ جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف دین اسلام کے بیان کردہ حقائق کے وزن کو گھٹانے کے لیے تسلسل اور توارث کے ساتھ منتقل ہونے والے اصل دین اور اس کے حقیقی مفہوم و تفسیر کو جو سلفِ صالحین سے تعامل و توارث کے ساتھ چلی آ رہی ہوتی ہے، اُسے روایتی فکر کا نام دیتا ہے۔ روایتی فکر کی اس تعبیر میں دراصل ایک قسم کا طنز پوشیدہ ہے اور یہ تعبیر بالکل مغربی مصنّفین کی اس تعبیر سے قریب ہے جو اسلام کو رَجعت پسندی اور دقیانوسیت قرار دیتے ہیں۔ یہ تجدّد پسند حضرات شاید یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح تہذیب ترقی کے مدارج طے کرتی ہے، اسی طرح مذہب کو بھی ترقی کرنی چاہیے۔ حالانکہ دینِ اسلام سراپا تسلیم و رضا کا نام ہے، اس میں جدت کے نام پر بدعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ کسی نئی تعبیر یا تفسیر کی ضرورت ہے۔ البتہ جدید نادر مسائل کا حل بھی پرانے مسائل ہی میں تلاش کیا جائے گا، اُنہیں قیاس کے ذریعے یا نصوص کے عموم سے یا اُصول فقہ کے قواعد کی روشنی میں حل کیا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ’’تم طے شدہ طریقے پر چلو اور نئی نئی باتوں کے چکر میں نہ پڑو، کیونکہ تمہیں ایسی کسی بھی جدت سے بے نیاز کر دیا گیا ہے‘‘ (سننِ دارمی:211)۔

آپ تجدُّد پسندوں کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو ان کے اندر یہ بات قدرِ مشترک ہے کہ ان میں سے اکثر کا حدیث و سنت کا علم سطحی درجے کا ہوگا۔ بعض تو اس سطحی علم سے بھی کورے ہوں گے، الٹا وہ یہ باور کرائیں گے کہ ان کو حدیث کی روایت سے آگے کی چیز، یعنی عقلیت و تجدُّد پسندی حاصل ہے، اس لیے ان سے روایتِ حدیث کی بابت سوال کرنا دراصل سائل کی کم فہمی یا کج فہمی کی دلیل ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی باور کرائیں گے کہ جس شعور و آگہی کے ہم حامل ہیں، علماء کا طبقہ اس سے محروم ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ علما ان وادیوں سے بخوبی واقف ہیں، جن وادیوں کے شناسا یہ تجدّد پسند ہیں اور اس سفر کے انجام سے بھی باخبر ہیں، اس لیے وہ اس راہ پر نہیں چلتے جو تجدّد پسندوں کی نظر میں شاہراہ ہے، وہ اسے بدعت یا آزاد خیالی سمجھتے ہیں، جیسا کہ آوارہ منش شعرا کے بارے میں قرآنِ کریم میں ہے: ’’اور (آوارہ) شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں، کیا آپ نے انہیں دیکھا نہیں کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور بیشک وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر عمل نہیں کرتے‘‘ (الشعراء: 224 تا

226)۔ پاکستان کے حکمرانوں میں لبرل ازم اور آزادروی کے پُرجوش علمبردار جنرل پرویز مشرف نے اسی کو ''اعتدال پر مبنی روشن خیالی'' کا نام دیا تھا۔

الغرض انہی خطرات کا ادراک کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا تھا: ''تم دین کے معاملہ میں خود کو وہاں پر روک لو، جہاں وہ (سلَف صالحین) رک گئے تھے، کیونکہ وہ علم رکھتے ہوئے رکے ہیں اور گہری نظر کی وجہ سے باز آ گئے ہیں۔ حالانکہ وہ ان باتوں پر سے پردہ اٹھانے کی پوری علمی صلاحیت رکھتے تھے اور اگر ایسا کرنا کوئی فضیلت کی بات ہوتی تو وہ اس کے زیادہ اہل تھے۔ اگر تم کہتے ہو کہ یہ (تجدّد پسندی) ان کے دور کے بعد وجود میں آئی ہے تو پھر جان لو کہ یہ ایسے ہی شخص کی ایجاد ہے جو ان کے راستے سے ہٹ کر چل رہا ہے اور ان کے طریقے سے منہ موڑ رہا ہے۔ سلَفِ صالحین نے اس دین کے وہ مَبادیات، اصولی عقائد اور مسلّمات بتا دیے ہیں جو کافی وشافی ہیں اور دین کے جتنے مسائل کی انہوں نے وضاحت کر دی ہے وہ کافی ہے۔ ان سے آگے بڑھ کر کوئی معرکہ سر ہونے والا نہیں ہے اور ان سے پیچھے رہ جانے سے بڑی کوئی تقصیر نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے ان سے پیچھے رہ جانا پسند کیا تو وہ جفا کار ہوئے اور بعض لوگوں نے ان سے آگے بڑھ جانا چاہا تو غُلوّ کا شکار ہوئے اور سلَفِ صالحین اِفراط وتفریط اور غُلُو و جفا کے مابین ہمیشہ توسط واعتدال کی راہ پر گامزن رہے ہیں'' (ابوداؤد: 4612)۔ علامہ اقبال نے بھی اسی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا:

اجتہاد اندر زمانِ اِنحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زِ اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اِقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

مفہومی ترجمہ: ''زوال کے زمانے میں (کم نظروں اور کم ہمتوں کا) اجتہاد امت کے نظم وضبط کی بساط کو لپیٹ دیتا ہے اور کم نظر عالموں کے اجتہاد کے مقابلے میں گزشتہ بزرگوں کی اقتدا (دین کے لیے) زیادہ محفوظ حکمتِ عملی ہے''۔

غامدی صاحب کے استاذ امام مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی تدبرِ قرآن کی نویں جلد کے دیباچے میں حضرت علیؓ کا یہ قول کسی حوالے کے بغیر نقل کیا ہے: ترجمہ: ''اس امت کے

پچھلے دور کے لوگ بھی اسی چیز سے اصلاح پائیں گے، جس سے دورِاول کے لوگ اصلاح پذیر ہوئے'' (الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ، ج:2، ص:403)۔

اس کائنات میں ایک اللہ تعالیٰ کا تشریعی نظام ہے، جس کے ہم جوابدہ ہیں اور اُس پر اُخروی جزا وسزا کا مدار ہے اور دوسرا تکوینی نظام ہے، جس میں بندے کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تابع ہے اور اس پر جزا وسزا کا مدار نہیں ہے۔ تکوینی نظام سبب اور مسبَّب اور علّت ومعلول کے سلسلے میں مربوط ہے۔ ''سبب'' سے مراد وہ شے ہے جو کسی چیز کے وجود میں آنے کا باعث بنے اور اُس کے نتیجے میں جو چیز وجود میں آئے، اُسے ''مُسَبَّب'' کہتے ہیں، اسی کو علّت ومعلول بھی کہتے ہیں، لیکن منطق وفلسفہ میں دونوں میں معنوی اعتبار سے تھوڑا سا فرق ہے۔ اسی بنا پر اس کائنات کے نظم کو عالَمِ اسباب اور قانونِ فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔

معجزہ سے مراد مدعیِ نبوت کے ہاتھ پر یا اُس کی ذات سے ایسے مافوق الاسباب امور کا صادر ہونا جس کا مقابلہ کرنے سے انسان عاجز آجائیں۔ نبی اپنی نبوت کی دلیل کے طور پر بھی معجزہ پیش کرتا ہے۔ مادّی اسباب کی عینک سے کائنات کو دیکھنے والے کہتے ہیں: قانونِ فطرت اٹل ہے، ناقابلِ تغیُّر ہے، لہٰذا قانونِ فطرت کے خلاف کوئی بات کی جائے گی تو اُسے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ منکرینِ معجزات نے مِن جملہ دیگر معجزات کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معراجِ جسمانی کا بھی انکار کیا اور کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جسمانی طور پر رات کو بیت المقدس جانا اور وہاں سے ایک سیڑھی کے ذریعے آسمانوں پر جانا قانونِ فطرت کے خلاف اور عقلاً مُحال ہے۔ اگر معراج النبی کی بابت احادیث کے راویوں کو ثِقہ بھی مان لیا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ اُنہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ یہ کہہ دینا کہ اللہ اس پر قادر ہے، یہ جاہلوں اور ''مرفوع القلم'' لوگوں کا کام ہے، یعنی ایسے لوگ مجنون کے حکم میں ہیں، کوئی عقلمند شخص ایسی بات نہیں کر سکتا۔ قانونِ فطرت کے مقابل کوئی دلیل قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایسی تمام دلیلوں کو اُنہوں نے راوی کے سَہو وخطا، دوراَز کار تاویلات، فرضی اور رکیک دلائل سے تعبیر کیا'' (تفسیر القرآن، جلد: 2، ص: 122 تا 123)۔ یہ سرسیّد احمد خاں کی طویل عبارت کا خلاصہ ہے۔ الغرض وہ معجزات پر ایمان رکھنے والوں کو جاہل اور دیوانے قرار دیتے ہیں، ہمیں وحیِ ربانی کے مقابل عقلی اُپج کی فرزانگی کے بجائے دیوانگی کا طعن قبول ہے، کیونکہ قدرتِ باری تعالیٰ کی جلالت پر

ایمان لانے ہی میں مومن کی سعادت ہے اور یہی محبتِ رسول ﷺ کا تقاضا ہے۔ان کی فکر کا لازمی نتیجہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور مختارِ کُل نہیں ہے، بلکہ العیاذ باللہ! وہ اپنے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کا پابند ہے۔

قرآنِ کریم کی واضح تعلیم ہے کہ کسی کو دینِ اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''دین (قبول کرنے) میں کوئی زبردستی نہیں ہے'' (البقرہ:256)۔مگر جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا ہو اُسے مسلمان رہنے کا پابند کیا جائے گا، اسی لیے اسلام میں اِرتداد موجبِ سزا ہے، جبکہ موجودہ متجددین کے نزدیک ارتداد اور ترکِ اسلام کوئی جرم نہیں ہے۔ جمہورِ امت کے نزدیک کتابیہ عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے، لیکن مسلمان عورت کا کتابی مرد سے نکاح جائز نہیں ہے، مگر متجددین ائمۂ دین کے اجماعی موقف سے انحراف کرتے ہوئے اس نکاح کے جواز کے قائل ہیں۔

اگر آپ اس تجدُّد دی فکر کی روح کو سمجھنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ جمہور امت وحیِ ربانی کو حتمی، قطعی اور دائمی دلیل سمجھتے ہیں، جبکہ یہ حضرات اپنی عقلی اُپج کو وحی کے مقابل لاکھڑا کرتے ہیں اور عقلی نتیجۂ فکر کے مقابل انہیں وحی کو ردّ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔وحی بتاتی ہے کہ عاقل مومن کو وحی اور خالق کی مرضی کے تابع رہ کر چلنا ہے، جبکہ تجدُّد کے حامی کہتے ہیں: ''میرا جسم میری مرضی''۔بعض متجدّدین حدیث کو تاریخ کا درجہ دیتے ہیں، جو رَطب و یابس کا مجموعہ ہوتی ہے، اُن کے نزدیک حدیث سے کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا، ماضی میں ایسے نظریات کے حامل اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہلاتے تھے۔اگر حدیث سے مطلب کی کوئی بات ثابت ہوتی ہو تو اپنی تائید میں لے لیتے ہیں اور اگر اُن کی عقلی اُپج کے خلاف ہو تو انہیں حدیث کو ردّ کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔جبکہ احادیثِ مبارکہ کی چھان بین اور صحت کو طے کرنے کے لیے باقاعدہ علوم اصولِ حدیث و اسماءُ الرِّجال وضع کیے گئے ہیں، جبکہ تاریخ کی چھان پھٹک اس طرح نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور ہم نے آپ کی طرف ذِکر (قرآنِ کریم) اس لیے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کو وہ احکام وضاحت کے ساتھ بتائیں جو اُن کی طرف اتارے گئے ہیں اور تاکہ وہ غور وفکر کریں'' (النحل:44)۔الغرض قرآنِ کریم کی تبیین کی ضرورت تھی اور

اُس کے مُبَیِّن (وضاحت سے بیان کرنے والے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔ اگر شریعت کو جاننے کے لیے قرآن کافی ہوتا تو مزید وضاحت کی ضرورت نہ رہتی، اسی لیے قرآنِ کریم نے ایک سے زائد مقامات پر فرائضِ نبوت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’اور وہ انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں‘‘۔ اکثر مفسرین کے نزدیک حکمت سے مراد سنّت ہے۔

ایک صحابیہ اُمِّ یعقوب تک حدیث پہنچی، جس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بعض کاموں پر لعنت فرمائی ہے۔ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آئیں اور کہنے لگیں: ’’میں نے دو جلدوں کے درمیان پورا قرآن پڑھا ہے، مجھے تو اس میں یہ باتیں نہیں ملیں‘‘۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ’’اگر تُو نے توجہ سے قرآن پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ باتیں مل جاتیں، کیا تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی: ’’اور جو کچھ تمہیں رسول دیں، اُسے لے لو اور جس سے وہ روکیں، اُس سے رک جاؤ‘‘ (الحشر: 7)۔ اُمِّ یعقوب نے کہا: ’’کیوں نہیں! میں نے یہ آیت پڑھی ہے‘‘ تو ابن مسعودؓ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان باتوں سے منع فرمایا ہے۔ اُس نے کہا: ’’میں نے دیکھا ہے کہ آپ کی اہلیہ یہ کام کرتی ہیں‘‘۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: ’’جاؤ دیکھو‘‘۔ وہ گئی اور دیکھا کہ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتیں، عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: ’’اگر میری اہلیہ ایسے کام کرتیں تو میں اُن سے تعلق نہ رکھتا۔ (بخاری:4886)

جُمہورِ امت کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث لازم وملزوم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے ’’سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اُس کی مثل بھی اُس کے ساتھ ہے، وہ وقت دور نہیں کہ ایک شخص شکم سیر اپنی مَسند پر ٹیک لگائے ہوگا اور کہے گا: اس قرآن کو لازم پکڑو، پس جو کچھ تم اُس میں حلال پاؤ اُسے حلال مانو اور جو کچھ تم اُس میں حرام پاؤ، اُسے حرام مانو۔ سنو! تمہارے لیے پالتو گدھا، کُچلیوں (سامنے کے دانتوں) سے شکار کرنے والے درندے (اور دوسری روایت میں پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے) حلال نہیں ہیں‘‘ (ابوداؤد: 4604)۔ (2) ’’آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہ وقت دور نہیں کہ ایک شخص کو میری حدیث پہنچے گی، وہ اپنی مَسند پر ٹیک لگائے ہوگا اور کہہ رہا ہوگا: ہمارے اور تمہارے درمیان (فیصَل)

کتاب اللہ ہے، سو ہم اُس میں جو حلال پائیں گے اُسے حلال جانیں گے اور جو حرام پائیں گے، اُسے حرام جانیں گے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا کسی چیز کو حرام قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے اللہ کا حرام قرار دینا'' (ترمذی: 2664)۔ خود قرآنِ کریم نے بتایا کہ حلال وحرام کو طے کرنے کا تشریعی اختیار رسول اللہ ﷺ کے پاس ہے؛ چنانچہ ارشاد ہوا: ''(اُس نبی کی شان یہ ہے کہ) وہ اُن کے لیے پاک چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں'' (الاعراف: 157)۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن نہ ہم پر نازل ہوا ہے، نہ ہم نے اترتے دیکھا ہے، یہ بھی اللہ کے رسول نے بتایا: یہ اللہ کا کلام ہے۔ پس جن صحابۂ کرام کی نقل وروایت سے ہمیں قرآن کا قرآن ہونا معلوم ہوا، اُنہی کے واسطے سے احادیثِ مبارکہ کا کلامِ رسول ہونا معلوم ہوا، اگر رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے تواترِ قولی اور فعلی کو نظر انداز کر دیا جائے تو فرض عبادات پر عمل کرنا بھی مشکل ہو جائے۔

جناب غامدی از خود جن دینی امور کو عہدِ رسالت مآب ﷺ تک محدود رکھتے ہیں، اُن میں جہاد بھی ہے اور کافر کو کافر نہ کہنا بھی ہے، جبکہ اُن کے نزدیک اتمامِ حجت کے بعد جہاد بمعنی قتال منسوخ ہو گیا ہے۔ چنانچہ خورشید ندیم صاحب انہی صفحات پر لکھ چکے ہیں کہ پاکستان کی بھارت کے خلاف جنگ جہاد نہیں ہے، بلکہ یہ ملکی دفاع کی جنگ ہے، جبکہ ہماری مسلّح افواج کا ماٹو ہے: ''ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ''۔

کون کافر ہے، کون مسلمان، متجددین کے نزدیک یہ اللہ کی عدالت میں قیامت میں طے ہوگا، ہم یہ طے کرنے والے کون ہیں، پس لازم ہے کہ آپ کفر کو کفر اور کافر کو کافر بھی نہ کہیں، اُن کے نزدیک جھوٹے مُدّعیِ نبوت مرزا غلام قادیانی کے لیے بھی گنجائش موجود ہے۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ انہوں نے کہا کہ مرزا غلام قادیانی کے اقوال کو بھی شیخِ اکبر اور دوسرے صوفیۂ کرام کے شطحیات پر محمول کیا جائے۔ متجددین کے نزدیک سنّت کی تعریف جمہورِ امت سے جدا ہے، اُن کے نزدیک سُنّت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین ﷺ تک چند امور کا نام ہے، پہلے انہوں نے سنّتوں کی تعداد 27 مقرر کی اور پھر بتدریج کم کرتے کرتے 17

تک آ گئے اور جمہورِ امّت کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شارع کی حیثیت سے جو شعار قائم کیے، وہ سب سنّت ہیں؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتیازات وخصائص اتباع کے لیے نہیں ہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام ومرتبہ کو پہچاننے کے لیے ہیں۔قرآن کی صریح آیت ہے: ''ان سب رسولوں (میں سے) ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے'' (البقرۃ: 253) اور خود سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''مجھے (دیگر) انبیائے کرام علیہم السلام پر چھ چیزوں میں فضیلت عطا کی گئی ہے (اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا بیان فرمایا)'' (مسلم: 523) جبکہ متجددین انبیائے کرام علیہم السلام کے درمیان تفضیل وتفاضل کے قائل نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''(اے میرے امتیو!) تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنّت کو لازم پکڑو، اُن کو داڑھ سے مضبوطی سے پکڑ لو اور ہاں! ایسے نئے امور سے (جن کی اصل سنّت میں نہ ہو) بچے رہو، کیونکہ ہر وہ بدعت (جو کسی سنّت کو مٹا دے) گمراہی ہے'' (ابن ماجہ: 42)۔اسی لیے جمہورِ امت کے نزدیک دین قرآن تک محدود نہیں ہے، بلکہ دین قرآن وسنّت کے مجموعے کا نام ہے۔سنّت قرآن کی ضد یا قرآن کے مقابل نہیں ہے، بلکہ یہ قرآنِ کریم کی تبیین ہے،تشریح ہے اور اس کی عملی تعبیر اور تفسیر ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''(اے رسولِ مکرّم!) آپ (وحیِ ربانی کو) جلد یاد کرنے کے شوق میں اپنی زبان کو جلدی حرکت نہ دیا کیجیے، اسے آپ کے (دل ودماغ میں) محفوظ کرنا اور اسے آپ کو پڑھانا ہمارے ذمۂ کرم پر ہے، پس جب ہم (بزبانِ جبرائیل) اسے پڑھ لیں تو آپ (اطمینان وقرار کے ساتھ) ان کی متابعت میں پڑھ لیا کیجیے، پھر اس (کے معانی) کو آپ پر ظاہر کرنا بھی ہمارے ذمے ہے'' (القیامہ: 16 تا 19)۔اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ میں معانی کا جو بحرِ زخّار موجود ہے، اس کی تفصیل وتشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول وفعل سے معلوم ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جا بجا نماز کا حکم دیا، متفرق مقامات پر اس کے بعض ارکان تکبیر، قیام، قرأت، رکوع اور سجود کا ذکر فرمایا، لیکن نماز پڑھنے کا پورا طریقہ قرآنِ کریم نے تعلیم نہیں فرمایا، یہ امت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعامل سے معلوم ہوا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم جیسے مجھے نماز پڑھتا دیکھو، ویسے ہی نماز پڑھو'' (بخاری: 631)۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’پس جب تم زمین میں سفر کرو اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر تمھیں مشکل میں ڈال دیں گے تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کر دو، (النسآء: 101)۔ اس سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا تھا کہ خطرات کی صورت میں تو مسافر نماز میں قصر کر سکتا ہے، لیکن حالتِ امن میں کیا یہی حکم ہے، صورتِ حال واضح نہیں ہو رہی تھی، حدیث پاک میں ہے: ’’یعلیٰ بن اُمیّہ نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے پوچھا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ’’اگر تمھیں کفار کی جانب سے خطرات میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو نماز کو قصر کر دو، اور اب لوگ محفوظ ہو گئے ہیں‘‘ تو حضرت عمرؓ نے کہا: جس بات پر تمھیں تعجب ہوا، مجھے بھی ہوا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ صدقہ (رعایت) ہے جو اللہ نے تمھیں عطا کیا تو اس کے اس صدقے کو قبول کرو‘‘ (ترمذی: 3034)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول تھا کہ دین کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے معلوم کرتیں، پس جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: جس سے حساب لیا گیا، وہ مبتلائے عذاب ہوگا، وہ بیان کرتی ہیں: میں نے پوچھا: اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے: عنقریب ان سے آسان حساب لیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: یہ اُن کی بابت ہے جن کی محض پیشی ہوئی، لیکن جس پر تفصیلی جرح ہوئی تو وہ ہلاک ہو جائے گا‘‘ (بخاری: 103)۔ آج کل کی زبان میں اسے ’’منی ٹریل‘‘ کہتے ہیں۔

علامہ سید شریف جرجانی لکھتے ہیں: ’’شریعت میں سنّت سے مراد وہ راستہ ہے جو دین میں اُن امور کی بابت مقرر کیا گیا ہے جو فرض اور واجب نہیں ہیں۔ پس سنّت وہ ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیشگی فرمائی اور کبھی چھوڑ بھی دیا، اگر یہ ہمیشگی عبادت کے طور پر ہو تو انھیں ’’سُنَنِ ہُدیٰ‘‘ کہتے ہیں اور اگر عادت کے طور پر ہو تو انھیں ’’سنَنِ زوائد‘‘ کہتے ہیں۔ سُنَنِ ہُدیٰ کو تکمیلِ دین کے لیے قائم کیا جاتا ہے اور اس کا ترک کراہت یا اِساءَت کا سبب بنتا ہے اور سُنَنِ زوائد وہ ہیں کہ جن پر عمل پیرا ہونا اچھی بات ہے اور ان کا ترک کراہت اور اِساءَت کا باعث نہیں ہوتا، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نشست و برخاست، لباس اور کھانے پینے کی عادات وغیرہ۔ سُنَنِ ہُدیٰ کو سنن مؤکدہ بھی کہتے ہیں، جیسے اذان، اقامت، کُلّی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور سنَنِ زوائد جیسے: منفرد کا اذان کہنا، مسواک کرنا اور نماز اور خارجِ نماز میں بعض امور کی رعایت کرنا، اس کا ترک سزا کا موجب نہیں ہوتا‘‘ (کتاب التعریفات، ص: 88)۔

غامدیت مدیر

جماعت اسلامی کی فکر اور جاوید غامدی

چند دن پہلے ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ جماعت اسلامی کے ایک ضلعی امیر نے جاوید غامدی صاحب سے ملاقات کی اور پھر ان کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے۔ اسی طرح ہمیں اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہے کہ جماعت کے اندر ایک خاصا حلقہ ہے (خصوصاً نوجوانوں کا) جو جاوید غامدی صاحب سے متاثر ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جاوید غامدی صاحب جماعت اسلامی کا پس منظر رکھتے ہیں، ان کی تحریر وتقریر سنجیدہ ومدلل ہوتی ہے اور عموماً وہ اشتعال میں آئے بغیر اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں اور انھوں نے اپنی فکر کو ایک منظم انداز میں پیش کیا ہے لیکن ان انسانی خوبیوں سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا نقطۂ نظر صحیح بھی ہے یا وہ جماعت کی فکر سے میل کھاتا ہے، یہاں چونکہ تفصیل کا محل نہیں لہٰذا ہم صرف دو انتہائی بنیادی امور کے تقابلی مطالعے سے یہ ثابت کریں گے کہ جماعت اسلامی کی فکر اور جاوید غامدی صاحب کی فکر میں بُعد المشرقین ہے، وہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور جماعتی فکر کا حامل کوئی شخص ان سے متاثر ہو ہی نہیں سکتا یا اسے ان سے متاثر ہونا نہیں چاہیے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جاوید غامدی صاحب کے مؤقف کی بنیادی ساخت کیا ہے؟ غامدی صاحب اصلاً متجدد ہیں۔ تجدید کا مطلب ہوتا ہے عصری دینی روایت کو اس حشو وزوائد اور بدعات وغیرہ سے پاک کرنا جو خلاف قرآن وسنت دین میں بوجوہ در آئی ہوں اور اس طرح دین کو اس طرح مصفّٰی اور مجلّٰی کر کے پیش کرنا جیسے وہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عہد خلفائے راشدین میں تھا۔ تجدد، تفعّل کے وزن پر، وہ امر ہے جسے بتکلف تجدید میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ وہ تجدید ہو جسے غیر اسلامی فکر سے متاثر ہو کر قبول کیا گیا ہو یا دینی اصول ومتون کی تشریح وتاویل کسی غیر اسلامی فکر کی روشنی میں کی گئی ہو۔ تجدید اور تجدد کی ان تعریفوں سے واضح ہے کہ جاوید غامدی صاحب مجدد نہیں متجدد ہیں۔ وہ مغرب کی الحادی

فکروتہذیب سے، خصوصاً اس کے سیکولرزم اور لبرل ازم سے متاثر ومرعوب ہیں اور اسلامی متون ونصوص کی تشریح وتاویل مغرب کی الحادی فکروتہذیب کی روشنی میں کرتے ہیں۔

ان کی اس مغرب پرستی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ سیکولرزم کی رو سے ریاست کے اسلامی تصور کا انکار کرتے ہیں۔ان کے نزدیک اسلام فرد کو مخاطب کرتا ہے لہٰذا ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ نیز مغربی تہذیب چونکہ اللہ کی بندگی کی بجائے عقل کی فرمانروائی پر یقین رکھتی ہے لہٰذا وہ ہر دینی امر کی توجیہ وتشریح عقلی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں اور چودہ سو سالہ مسلّمہ علمی روایت کو رد ّکر کے مغربی اصول واقدار کی روشنی میں قرآن وسنت سے براہ راست استنباط کے نام پر اسلامی متون ونصوص کی تشریح مغربی فکروتہذیب کی روشنی میں کرتے ہیں جیسے مغربی جمہوریت اور نیشن سٹیٹ کے تصور کو جائز قرار دینا۔

اس کے مقابلے میں مولانا مودودیؒ مغرب کی الحادی فکروتہذیب کو جاہلیت خالصہ قرار دیتے ہیں۔اپنے مضمون 'اسلام اور جاہلیت' میں وہ توحید کے مقابلے میں شرک کو جاہلیت قرار دیتے ہیں لیکن مغربی تہذیب شرک ہی نہیں کفر پر مبنی ہے اللہ کے مقابلے میں انسان کی خدائی کی دعویدار ہے (ہیومنزم) اس لیے مولانا نے اسے جاہلیت خالصہ یعنی خالص جاہلیت قرار دیا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب تنقیحات میں مغربی فکروتہذیب کے دلائل کے پرخچے اڑا دیے ہیں اور اسے ضیغ وضلال ثابت کیا ہے۔

اسی طرح مولانا کی فکر کی ایک بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ اسلام کا تعارف اقامت دین، حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظام زندگی کے طور پر کراتے ہیں جس کا مرکزی نقطہ 'انقلابِ امامت' ہے یعنی زندگی کی باگ ڈور فساق وفجار سے چھین کر اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھ میں آجائے تاکہ وہ اظہار دین یعنی دین کو غالب کرسکیں، یعنی صالحین مثالی اسلامی ریاست قائم کر کے اقتدار کو اسلام کے غلبے کے لیے استعمال کریں۔مولانا اپنے سارے علمی وفکری کام میں روایت سے نہیں کٹتے، غامدی صاحب کی طرح حدیث کا انکار واستخفاف نہیں کرتے اور جمہور امت ومجتہدین کے تعامل کی نفی نہیں کرتے۔وہ اسلام کو عصر حاضر سے مربوط دکھانے کے لیے عقلی دلائل اور اسلوب سے کام لیتے ہیں لیکن عقل کو وحی اور روایت پر غالب نہیں کرتے۔

ان گزارشات کو اگر تفہیم واختصار کی خاطر ایک جدول کی صورت میں پیش کیا جائے تو

مولانا مودودیؒ اور جاوید غامدی صاحب کی فکر میں مغائرت اور بُعد واضح ہو جائے گا۔

مولانا مودودیؒ کی فکر	جاوید غامدی کا موقف
۱۔ روایت کی پاسبانی، سنت کی حجیت کو تسلیم کرنا اور جمہور امت اور جمہور علماء کی فقہی وکلامی روایت کو ردّ نہ کرنا۔	۱۔ سنت کی حجیت کا انکار و استخفاف، امت کی علمی وفکری روایت کو ردّ کرنا
۲۔ مغربی فکر وتہذیب کو جاہلیت خالصہ کہہ کر ردّ کرنا اور روایت کے اندر رہ کر تجدید دین کی کوشش	۲۔ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کو قبول کرنا اور اسلامی متون کی تشریح اس فکر کی روشنی میں کرنا یعنی تجدد
۳۔ اسلامی ریاست اور اس کے ذریعے اقامت دین اور غلبۂ اسلام کا تصور پیش کرنا، انقلاب امامت کو مرکزی اہمیت دینا	۳۔ اسلامی ریاست کا انکار اور دین کو فرد پر ترکیز کرتے ہوئے دکھانے پر اصرار، انقلاب امامت کی اہمیت کی نفی
۴۔ مغربی جمہوریت میں اسلامی اصول داخل کر کے اسے اسلامی جمہوریت قرار دینا، قومیت کی نفی کرنا۔	۴۔ مغربی جمہوریت اور نیشن سٹیٹ کے تصور کی حمایت اور اسلامی جمہوریت کا مذاق اڑانا
۵۔ عصری ذہن کی تفہیم کی خاطر اسلام کو مدلل انداز میں پیش کرنا لیکن عقل کو اصول ومتون پر ترجیح نہ دینا۔	۵۔ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے متاثر ہو کر دین کی تشریح وتاویل عقلی بنیادوں پر کرنا۔
٦۔ سیاسی اور مسلکی اختلافات سے قطع نظر امت کے سنجیدہ علماء مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو نہ گمراہ قرار دیتے ہیں اور نہ کوئی نیا فرقہ اور نہ مولانا کو منکرین حدیث اور منکرین فقہ میں شمار کرتے ہیں۔	٦۔ جمہور علماء سب کے سب جاوید غامدی کو انکار و استخفاف حدیث کا مرتکب اور امت کی فقہی وعلمی روایت کا منکر اور گمراہ قرار دیتے ہیں۔

اختصار کی خاطر ہم انہی نکات پر اکتفا کرتے ہیں اور اس مختصر موازنے سے بھی ظاہر

ہوجاتا ہے کہ مولانا مودودیؒ اور جاوید غامدی صاحب کے خیالات میں بُعد المشرقین ہے۔

ان کے خیالات ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور جماعت اسلامی کے کسی فرد کو زیبا نہیں کہ وہ غامدی صاحب کی پیروی کرے یا ان کے خیالات کو اچھا سمجھے بلکہ ہر مسلمان کو اور ہر تحریکی فرد کو مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کو رد کرنا چاہیے اور اس تہذیب کے علمبردار، متجدد اور گمراہ شخص (جاوید احمد غامدی) کو رد کرنا چاہیے۔

مغربی تہذیب کے تنقیدی مطالعے کے لیے ہماری تین کتابیں مطالعہ فرمائیے، ہمارے ماہنامہ البرہان کا مطالعہ کیجیے جس میں کثرت سے ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جو جاوید غامدی کے گمراہ کن خیالات کی مدلل تردید کرتے ہیں۔ غامدی صاحب کی گمراہ فکر کے خلاف بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، وی لاگ کیے جا چکے ہیں۔ اس پر ہماری ای بک بھی ان شاء اللہ جلد قارئین کو مہیا کی جا رہی ہے۔

بقیہ: ۲۷ ویں ترمیم کی اصل حقیقت

اصل مدعے کی بات یہ ہے کہ افغانستان پر حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ امریکا نے بگرام ایئر بیس کے لیے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ پاکستان حملہ شروع کرے گا اور افغانستان پر امریکی بمباری کا پھر آغاز ہو جائے گا۔ پچھلے پچیس سالوں سے پاکستانی میڈیا مقتدرہ کے حکم پر افغانستان، طالبان اور وزیرستان کے پٹھانوں کے خلاف پروپگنڈہ کی بمباری کر رہا ہے اور ظاہر ہے، مغربی میڈیا بھی یہی کام کر رہا ہے۔

میں اپیل کرتا ہوں علماء سے، اسلامی صحافیوں سے، دینی جماعتوں کے قائدین سے، کہ اس پروپگنڈے کے بم سے اپنے کو بچائیں اور حالات و معاملات کو اس کے درست تناظر میں پیش کریں۔ وار آن ٹیرر اور پروپیگنڈہ پاور کو سمجھیں۔ آپ کے لیے اسلام اور شریعت، ہر قسم کی قوم پرستی (بشمول پاکستانی اور مسلم قوم پرستی) اور مسلک پرستی سے بہت اوپر کی چیز ہونی چاہیے اور وہی چیز مغرب اور مغربیت کے لیے سخت ناپسندیدہ ہے۔

غامدیت /مطالعۂ کتاب محمد مدثر علی راؤ

علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
احادیث پر غامدی صاحب کی باریک واردات

غامدی صاحب نے مجموعہ احادیث پر مبنی اپنی کتاب ''علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' میں جتنی بھی احادیث جمع کی ہیں ان میں ہر جگہ نہایت منظم انداز میں ایسے کاروائی کی ہے کہ ایک عام قاری جب اس کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے ذہن میں غیر دانستہ طور پر غامدی صاحب کے نظریات سرایت کر جاتے ہیں۔اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

غامدی صاحب نے ''اتمام حجت اور عذاب'' کے عنوان کے تحت چند احادیث کو جمع کیا لیکن اس سے پہلے عنوان کے ذیل میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کے سمجھنے میں اُس کے" قانون اتمام حجت" کی اہمیت مدرسہ فراہی کے علما نے اب ہر لحاظ سے واضح کردی ہے۔اس قانون کا ذکر روایتوں میں بھی ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور آخرت، دونوں کے اعتبار سے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔ہم نے یہ روایتیں اس باب میں جمع کردی ہیں۔''﴿۱﴾

قارئین درج بالا عبارت میں غامدی صاحب کا یہ جملہ ضرور یاد رکھیں ''اس قانون کا ذکر روایتوں میں بھی ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا اور آخرت، دونوں کے اعتبار سے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔''

اب اس عبارت کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آگے جو حدیث غامدی صاحب نے پیش کی ہوگی اس میں اس قانون اتمام حجت کا بڑی صراحت کے ساتھ ذکر ہوا ہوگا کیونکہ غامدی صاحب نے تو پوری قطعیت کے ساتھ اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کی ہے۔اب ذرا وہ حدیث بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''ابو بردہ اپنے والد عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

﴿۱﴾ علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۶۸۵

فرمایا: یہ امت (جس میں میری بعثت ہوئی)، وہ امت ہے کہ اس پر بڑی رحمت ہوئی ہے۔ اس پر عذاب انھی کے ہاتھوں سے آئے گا۔ (پھر) جب قیامت کا دن ہوگا تو وہاں بھی ان کے اہل ذمہ یا اہل شرک میں سے ہر شخص کو انھی میں سے کسی کے حوالے کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ جہنم سے تمہارا فدیہ ہے۔''[۱]

قارئین کرام! اس حدیث کو پڑھ کر آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس میں قانون اتمام حجت کا پہلو کہاں سے اور کیسے نکلتا ہے اور غامدی صاحب نے کیسے زبردستی اس میں اپنا خود ساختہ قانونِ اتمام حجت کا مطلب داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔

غامدی صاحب نے حدیث کا ترجمہ کرتے وقت کیا کاروائی کی ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں: حدیث میں رسول اللہ کا فرمان ہے کہ ''یہ امت، وہ امت ہے کہ اس پر بڑی رحمت ہوئی''۔غامدی صاحب نے حدیث کا ترجمہ کرتے وقت ''یہ امت'' کے الفاظ کے ساتھ بریکٹ میں لکھ دیا۔ ''جس میں میری بعثت ہوئی''

غامدی صاحب نے بریکٹ میں یہ الفاظ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے رسول اللہ کے فرمان کو صرف زمانہ رسالت سے خاص کر دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس حدیث میں اس امت کے لیے جو عذاب کی خبر رسول اللہ نے سنائی وہ صرف زمانہ رسالت کے مشرکین کے لیے تھی نہ کہ بعد کے لوگوں کے لیے۔ پھر حدیث کے بعد اس کے حاشیہ میں بھی غامدی صاحب حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعنی زمانہ رسالت کے بنی اسمٰعیل اور یہود ونصاریٰ جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے براہ راست اتمام حجت کیا۔''[۲]

یہاں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ غامدی صاحب اس حدیث کو زمانۂ رسالت سے مخصوص قرار دے رہے ہیں۔

قارئین کرام! اب ذرا ہم آپ کے سامنے غامدی صاحب کی وہی بات پیش کرتے ہیں جسے ہم نے شروع میں آپ کو یاد رکھنے کے لیے عرض کیا تھا کہ:

''اس قانون کا ذکر روایتوں میں بھی ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا اور آخرت، دونوں

---

[۱] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلد ا،ص ۶۸۵، ۶۸۶

[۲] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ا،ص ۶۸۶

کے اعتبار سے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت فرمائی ہے۔"

دیکھیں! غامدی صاحب کتنی قطعیت کیساتھ دعویٰ کر رہے تھے کہ ان کے خود ساختہ قانون اتمامِ حجت کا ذکر ان روایتوں میں ہوا ہے اور صرف ذکر ہی نہیں ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے بعض پہلوؤں کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ غامدی صاحب جب آپ کے قانونِ اتمامِ حجت کا ذکر حدیث میں ہوا تھا تو پھر آپ کو کیا ضرورت پیش آئی کہ آپ نے حدیث کے ترجمہ میں بریکٹ لگا کر رسول اللہ کے فرمان کو صرف زمانۂ رسالت سے مخصوص کر دیا اور پھر حدیث کی تشریح میں بھی رسول اللہ کے فرمان کو صرف زمانہ رسالت کے یہود و نصاریٰ تک خاص کر دیا؟ یعنی جس بات کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرما دی تھی غامدی صاحب نے اس وضاحت کی بھی ایک اور وضاحت پیش کی جس کا رسول اللہ کی وضاحت سے کوئی تعلق نہیں بن رہا۔

اصل میں غامدی صاحب نے اس پوری کتاب میں اپنے باطل نظریات کا پرچار کرنے کے لیے اسی قسم کی واردات ڈالی ہے اور وہ یہی ہے کہ:

غامدی صاحب پہلے ایک عنوان قائم کرتے ہیں پھر اس کے نیچے اپنے حساب سے ایک مختصر سی تمہید باندھتے ہیں تاکہ وہ اپنے قاری کا ذہن بنا سکیں کہ اس نے حدیث کو کس زاویے سے پڑھنا ہے۔ بیشک غامدی صاحب کی اس تمہید کا دور دور تک حدیث سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن موصوف زور زبردستی اسے حدیث سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ فرمائیں: غامدی صاحب نے جب تکفیر سے متعلق احادیث جمع کیں تو "مسلمان کی تکفیر" کے عنوان کے تحت یہ تمہید قائم کی کہ:

"دنیا میں جو لوگ مسلمان ہیں، اپنے مسلمان ہونے کا اقرار، بلکہ اُس پر اصرار کرتے ہیں، لیکن پھر کوئی ایسا عقیدہ و عمل اختیار کر لیتے ہیں، جسے کوئی عالم یا علما یا دوسرے تمام مسلمان صحیح نہیں سمجھتے۔ اُن کے اس عقیدے یا عمل کو ضلالت اور گمراہی بھی کہا جا سکتا ہے اور اُسے کفر و شرک بھی قرار دیا جا سکتا ہے، مگر اس کے حاملین کو کوئی شخص یا ادارہ یا حکومت کیا غیر مسلم یا کافر بھی قرار دے سکتی ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کچھ رہنمائی اس معاملے میں فرمائی ہے، وہ اس باب

کی روایتوں سے سمجھی جا سکتی ہے۔"[۱]

اب دیکھیں یہاں بھی غامدی صاحب نے قادیانیوں کا نام لیے بغیر اشارۃً ان کا ذکر کیا ہے اور تمہید اس انداز سے باندھی ہے کہ گویا آگے جو حدیث غامدی صاحب پیش کریں گے اس میں کوئی ایسی مثال پیش کی جائے گی جو قادیانیوں کی صورتحال پر منطبق ہوگی لیکن آگے اس باب میں صرف تین احادیث پیش کی گئی ہیں ہم وہ تینوں احادیث آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

پہلی حدیث: ثابت بن ضحاک ؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی مسلمان پر یا فرمایا کہ کسی بندہ مومن پر کفر کی تہمت لگائی تو یہ اسی طرح ہے، جیسے اُس نے اس کو قتل کر دیا اور جس نے اس پر لعنت کی اس نے بھی گویا اسے قتل کر دیا۔

دوسری حدیث: عبداللہ بن عمر ؓ سے مروی ہے، انھوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بھی اپنے (مسلمان) بھائی کو کہا: اے کافر، تو دونوں میں سے ایک یہ ہو کر رہے گا۔ اگر اس کا وہ بھائی اس کا مصداق ہوا، جس کو اس نے کافر قرار دیا تو وہی اور اگر نہ ہوا تو کہنے والے کی یہ بات خود اسی پر لوٹ جائے گی۔[۲]

تیسری حدیث: ابوذر ؓ روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: جو شخص بھی کسی دوسرے پر فسق یا کفر کی تہمت لگائے گا، اگر وہ ایسا نہیں ہوا تو اس کی یہ تہمت اسی پر لوٹ جائے گی۔[۳]

قارئین کرام! یہ وہ تین احادیث ہیں جنہیں غامدی صاحب نے تکفیر کے باب میں جمع کیا ہے اور ان تینوں احادیث میں سے کہیں سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر قادیانیوں یا ان کی طرح کا کوئی گروہ جو رسول اللہ کے بعد کسی دوسرے شخص کو نبی مانے اور اس کے منکرین کو کافر کہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا انکار کرے تو ایسے گروہ کی تکفیر نہیں کی

---

[۱] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۴۴

[۲] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۴۶

[۳] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۲۴۸

جائے گی۔ البتہ غامدی صاحب کی طرف سے جو دوسرے نمبر پر حدیث پیش کی گئی ہے اس سے قادیانیوں کی تکفیر کا فیصلہ ضرور کیا جا سکتا ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ''جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے اور وہ دوسرا شخص اس کا مصداق نہ ہوا جس کو اس نے کافر قرار دیا، تو فتویٰ لگانے والا خود کافر ہو جائے گا۔'' اس حدیث کے مطابق سوال پیدا ہوتا ہے کہ قادیانی جو ہم کلمہ گو مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں کیا ان پر کفر واپس لوٹتا ہے یا نہیں؟ خود غامدی صاحب کو بھی قادیانی کافر ہی سمجھتے ہیں تو کیا غامدی صاحب بتا سکتے ہیں کہ قادیانیوں پر کفر واپس لوٹتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ حدیث کے مطابق دونوں میں سے کوئی ایک شخص تو کافر ہو کر ہی رہے گا۔

ممکن ہے کہ غامدی صاحب کا کوئی معتقد یہ اعتراض کرے کہ محدثین بھی تو حدیث لکھنے سے پہلے اس پر باب قائم کرتے ہیں تو غامدی صاحب نے بھی اسی کی مانند تھوڑی سی تمہیدی گفتگو کر دی تو کیا غلط کیا۔ یہی کام تو محدثین نے بھی کیا ہوا ہے۔

تو ایسا اعتراض کرنے والوں سے ہم عرض کر دیں کہ محدثین جو بھی باب قائم کرتے ہیں تو اس کا ذکر حدیث میں ضرور ہو رہا ہوتا ہے۔ مثلاً محدثین نے نزول مسیح کی احادیث پر باب قائم کیا ''باب نزول عیسیٰ علیہ سلام'' تو اس باب کے تحت جو بھی حدیث وہ درج کریں گے تو اس میں عیسیٰ علیہ سلام کے نزول کا ہی ذکر آپ کو ملے گا ایسا نہیں ہوگا کہ باب تو نزول عیسیٰ علیہ سلام کا ہو لیکن حدیث میں رفع یدین کا تذکرہ ہو رہا ہو۔ جیسا کہ غامدی صاحب نے کیا ہے کہ تمہید میں کچھ لکھ رہے ہیں اور حدیث میں کچھ اور بیان ہو رہا ہے۔

لطیفہ

آخر میں ایک لطیفہ بھی ملاحظہ فرماتے جائیں: غامدی صاحب نے ''اتمام حجت اور عذاب'' کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا کہ حدیث مبارکہ میں اتمام حجت کا ذکر ہوا ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود وضاحت بھی فرمائی ہے۔ پھر غامدی صاحب کا یہ بھی اصول ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا اور یہ اصول غامدی صاحب نے اپنی کتاب کے شروع میں بھی لکھا ہوا ہے۔

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب نے قانون اتمام حجت اور عذاب کے تحت جب احادیث کو جمع کیا تو وہاں ان کی تشریح کرتے وقت حاشیہ میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: ہماری کتاب ''میزان'' میں مضامین ''قانون دعوت اور'' قانون جہاد'' اور مقامات میں ''رسولوں کا اتمام حجت۔''[۱]

دیکھیے! یہاں پر غامدی صاحب حدیث اور اس میں بیان ہوئے قانون اتمام حجت کو بجائے قرآن کی روشنی میں سمجھانے کے اپنی کتاب ''میزان اور مقامات'' کی روشنی میں سمجھنے کا کہہ رہے ہیں جبکہ ان کا دعویٰ تو حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کون سی روشنی ہے جو قرآن سے ہوتے ہوئے غامدی صاحب کی کتب پر جا پہنچی کہ اب حدیث قرآن کے بجائے غامدی صاحب کی کتب کی روشنی میں سمجھی جائے گی۔

یہ واقعہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ غامدی صاحب نے ''اتمام حجت اور عذاب'' کے عنوان کے تحت جو تمہید باندھی تھی اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''حدیثوں میں قانون اتمام حجت کا ذکر ہوا ہے اور رسول اللہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے'' غامدی صاحب کا یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اگر غامدی صاحب کا یہ خود ساختہ قانون احادیث میں وضاحت سے پیش ہوا ہوتا تو موصوف کبھی بھی اپنے قارئین کو اپنی کتب کی طرف مراجعت کرنے کا نہ کہتے۔

خلاصہ

اس ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ مسٹر غامدی نے آٹھ یا نو سال کا عرصہ لگا کر علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے جو مجموعہ احادیث مرتب کیا ہے اس میں انہوں نے ہر موضوع پر احادیث جمع کرنے سے پہلے اپنے نظریے کے مطابق ایک ایسی تمہید قائم کی ہے کہ جس کا تعلق حدیث سے تو نہیں ہوتا لیکن غامدی صاحب خود سے ہی اسے حدیث سے جوڑ دیتے ہیں اور اپنے قارئین کو ایسا تاثر دیتے ہیں کہ گویا غامدی صاحب نے اس امت میں جو جو باطل نظریات پیش کیے ہیں وہ سب تو ان احادیث سے ثابت شدہ ہیں جبکہ حقیقت میں غامدی صاحب نے پہلے ایک نظریہ بنایا پھر اس کے بعد احادیث کو درج کر کے اس کا معنیٰ مفہوم اپنے اس نظریے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور یہ ساری کاروائی انہوں نے نہایت ہی منظم اور غیر محسوس انداز میں کی ہے۔

---

[۱] علم النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱، ص ۶۹۱

تفہیم اسلام

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

حصولِ غلبہ واقتدار اور بعثتِ انبیاء کا مقصد

البرہان کے شمارہ ستمبر ۲۰۲۵ء میں ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عثمان احمد نے مذکورہ عنوان پر جو کچھ لکھا ہے، ہمارے خیال میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کا بنیادی مقصد تعلیم وتزکیہ نفس ہے اور اس کا ذریعہ دعوت وتبلیغ اور تذکیر ونصیحت ہے۔ انبیاء انذار کرنے والے یعنی ڈرانے اور خبردار کرنے والے ہوتے ہیں، جبر کرنے والے نہیں۔ غلبہ واقتدار ان کا مقصود نہیں ہوتا۔

ا۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء اپنی دعوت میں اقتدار چھیننے، تخت گرانے اور تاج اچھالنے کی بات نہیں کرتے۔ نہ حضور ﷺ نے مکے میں ایسی بات کی نہ مدینے میں۔ آپ اپنے مخاطبین کو رب کی طرف بلانے، رب سے جڑنے، اسی کا ہو رہنے اور اسی کے حضور سرخروئی حاصل کرنے کے لیے فکرمند کرتے رہے۔ ہم ڈاکٹر عثمان احمد کے دلیل میں مزید اضافہ کرنا چاہیں گے کہ وادئ قبا کے پہلے خطاب میں نہ قریشِ مکہ کے مظالم اور ان کے اقتدار کا کوئی ذکر ہے اور نہ مدینے میں پنجۂ یہود کو مروڑنے کی کوئی بات ہے جو یہاں کی معیشت وسیاست پر قابض تھے۔ مسجد نبوی کے افتتاحی خطاب میں کوئی ہلکا سا بھی اشارہ کسی قابض قوت سے ٹکرانے کا نہیں۔ غزوۂ بدر کے خطاب میں قریش کے غلبہ کو توڑنے کی کوئی بات نہیں اور ۹ھ میں تبوک کے محاذ پر جو طویل خطبہ دیا اس میں رومن ایمپائر اور قیصر روم کے تخت کو الٹنے کا کوئی اشارہ تک نہیں۔ بالفاظ دیگر پورے ذخیرۂ حدیث میں حکومتیں بدلنے کے لیے وہ بے تابیاں دکھائی نہیں دیتیں جو ہمارے ہاں کے انقلابیوں کے لب ولہجے اور زبان وبیان میں جھلکتی ہیں۔

۲۔ نبی کریم ﷺ نے یقیناً حکومت الٰہیہ کے قیام کا نعرہ تو نہیں لگایا لیکن حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے مرحلہ بمرحلہ ہر ممکن تدبیر اختیار کی ہے۔ مدنی زندگی کی ابتداء ہی میں مسلمانوں اور یہودِ مدینہ کے تینوں قبائل کے درمیان میثاقِ مدینہ کی شرائط میں قیامِ امن اور دفاع مدینہ کی شرائط کے ساتھ باہمی تنازعات میں نبی ﷺ کی آخری حاکمانہ حیثیت کا منوا

لینا کیا اس بات کا اظہار نہیں ہے کہ آپ حکومت وتسلط کو اسلامی مقاصد یعنی تزکیہ وتربیت کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ پھر آپ نے اطراف مدینہ کے قبائل بنو جہینہ، بنوضمرہ ودیگر سے غیر جانبدار رہنے کے معاہدے کیے تاکہ صفہ مکتب کے تعلیمی وتربیتی عمل کو جتنی یکسوئی اور پُرامن حالات کی ضرورت ہے اس کے لیے ان قبائل اور قریش کی یلغاروں سے تحفظ ہو سکے۔ اطراف مدینہ میں ہر گھڑی پٹرولنگ، دستوں کی نگرانی اور بدر واحد، خندق وخیبر میں کفار کے سامنے مزاحمت استحکام حکومت کا ذریعہ بنی۔ صلح حدیبیہ میں قریش کی مرضی کی شرائط مان کر ریاست مدینہ کی توسیع کی تدبیر کی۔ زندگی کے آخری لمحات میں ملک شام کی سرحد کی طرف لشکرِ اسامہ کی روانگی اسلامی سلطنت کی حفاظت کو اسلامی ذمہ داری باور کرانے کے لیے کافی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت واقتدار اللہ کے نبی کے پیش نظر نہیں تھا تو مدینے میں آتے ہی مدینے میں آباد دیگر اقوام سے اللہ کے نبی نے جو اپنی حاکمانہ حیثیت منوائی تو کیا آپ نے یہ کام اپنی منصبی ذمہ داریوں سے تجاوز کر کے کیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جو مسلمان ہجرت کر کے مدینے نہیں آئے قرآن کے مطابق اسلامی اجتماعیت پر ان کا کوئی حقِ ولایت نہیں رہا۔ گویا معیاری مسلمان وہ قرار پائے جو اسلامی اجتماعیت یا حکومت اسلامی کے قیام میں مددگار بن گئے۔

اب ہم صاحبِ مضمون کے دلائل کا ترتیب وار جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ ﴿لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ﴾ [الغاشیہ ۲۲:۸۸] ''آپ ان پر حوالدار نہیں ہیں۔'' اور ﴿وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ﴾ [ق ۴۵:۵۰] ''آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہیں۔'' سے یہ مراد لینا کہ دین میں کسی قسم جبر یعنی حکومتی تسلط کی گنجائش نہیں، محلِّ نظر ہے۔ ایک تو یہ آیات مکی دور سے متعلق ہیں جن کا مقصد آپ کو اور نبوت کا انکار کرنے والوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ دین منوانا نبی کی ذمہ داری نہیں، نصیحت وابلاغ کرنا ذمہ داری ہے۔ البتہ جب کوئی مسلمان ہوگا یعنی اسلامی سوسائٹی کی ممبر شپ کی شرائط قبول کرلے گا تو اس پر اسلامی حکومت ادائیگی نماز وزکوٰۃ اور امرونہی کے معاملے میں جبر کرنے کا حق رکھتی ہے ﴿اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ

الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾[الحج ۲۲:۴۱]اور دنیا کا کوئی بھی ڈسپلن جبر کے بغیر مؤثر نہیں ہوتا۔ والدین بچوں کو جبراً مار پیٹ کر نماز پڑھا سکتے ہیں (ابوداؤد، ترمذی) شوہر بیوں کو جبراً، ضرباً سرکشی سے روکنے کا حق رکھتا ہے (النسا: ۴: ۳۴) قرآن میں بیان کردہ حدود کا نفاذ حکومتی جبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اللہ کے نبی نے چور کے ہاتھ کاٹ کر زانی کو رجم کر کے جبر تو کیا ہے بلکہ جو حکمران یا قاضی احکام الٰہی کی تنفیذ میں جبر نہیں کرے گا تو ان میں سے کوئی کافر، کوئی ظالم تو کوئی فاسق قرار پائے گا۔ (المائدہ: ۶: ۴۴، ۴۵، ۴۷) حدود الٰہی کے نفاذ میں کسی قسم کی نرمی سے منع کیا (النور: ۲۴: ۲) ۔ اللہ کے نبی کے جبار نہ ہونے کا مطلب مطلق جبر کی نفی سمجھ لینا سنگین مسئلہ ہے۔

۲۔ نوحؑ کی قوم کے سرداروں کا کہنا :﴿ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ﴾ [المومنون ۲۴:۲۴]''یہ تم پر برتری چاہتے ہیں''اور فرعون کے درباریوں کا موسیٰ وہارون کے بارے میں کہنا :﴿يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾[طہ ۲۰:۶۳]''دونوں چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے جادو کے زور سے تمہاری سرزمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طرز زندگی کو برباد کر دیں۔'' ان آیات سے مضمون نگار کا یہ استدلال کرنا کہ کسی نبی نے نہیں کہا کہ ہم تم پر غلبے کے لیے مبعوث کیے گئے ہیں بلکہ کفار ان پر یہ الزام دھرتے تھے کہ یہ غلبہ واقتدار چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بات درست ہے لیکن کافروں کا یہ کہنا درحقیقت ان کے اس خوف کا نتیجہ ہے انبیاء جس لا الٰہ الا اللہ کی بات کرتے ہیں وہ محض قلب پر ضربیں لگانے تک محدود نہیں رہے گی بلکہ انسانی معاشرت کو تبدیل کر کے رکھ دے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کے ماننے کے نتیجے میں انہیں نبی کے اور ان کے حواریوں کے پیچھے چلنا پڑتا اور معاشرتی احوال بھی تبدیل ہوتے، بہت سے پست بلند ہوتے اور سرکش پست ہو جاتے۔ یہ تو لا الٰہ الا اللہ کی دعوت کے نتیجے میں فطری طور پر ہونے کا امکان ہر دور میں موجود رہا ہے۔ ہاں البتہ آج ہمیں اس بات کا سمجھ میں آنا اس لیے مشکل دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے جو بھائی محض کلمے نماز کی بات کرتے ہیں تو اہل اقتدار انہیں یہ طعنہ کبھی نہیں دیتے جو نبیوں کو سننا پڑا۔ اس کی وجہ بقول اقبال یہی ہے کہ:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط مسئلۂ علمِ کلام

اور

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہُو اللہ ہُو

آج مسلمانوں کے فاسق وفاجر حکمران ہوں یا اولیائے کفر، وہ ہمارے واعظین ومبلّغین سے اقتدار سے بے دخلی کا خطرہ محسوس نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ واعظین یا تو زمین سے نیچے (قبر) کی بات کرتے ہیں یا آسمان سے اوپر (جنت ،دوزخ) کی۔اس زمین پر جو لوگ جھوٹے خدا بنے بیٹھے ہیں، ان کی خدائی کو تو ان کی دعوت میں کوئی چیلنج نظر ہی نہیں آتا۔) فرعونی درباریوں کو موسیٰؑ کی دعوت سے یہ خطرہ تھا کہ ان کا مثالی طرز زندگی یا مثالی تہذیب خطرے میں پڑ جائے گی۔یہ کون سا مثالی طرز زندگی تھا جس میں بے گناہ بچوں کو ذبح کیا جاتا تھا، لاکھوں بنی اسرائیل سے بیگار میں کام لیا جاتا تھا۔

۳۔ سورۂ حج کی آیت ۴۱، القصص کی آیات ۵،۶ اور النور کی آیت ۵۵ سے مضمون نگار کا یہ استدال کہ خلافت واقتدار عطائے ربانی ہے نہ کہ انقلابی جدوجہد کا نتیجہ۔اس کے ساتھ ان کی یہ بات بھی تسلیم کہ حصول اقتدار فرض عین نہیں لیکن مضمون نگار کے ذمے اس سوال کا جواب تو بنتا ہے کہ اگر یہ فرض عین نہیں تو کیا فرض کفایہ ہے، واجب ہے یا مستحب۔میرے جیسے کم فہموں کے لیے فقہی اعتبار سے اس کا کوئی درجہ تو متعین کریں کیونکہ حضرت یوسفؑ نے جب بادشاہ کو اپنا عقیدت مند دیکھا تو انہوں نے اس کی عقیدت مندی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مطالبہ کیا:﴿ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ [یوسف ۱۲:۵۵] "زمین کے خزانوں پر مجھے نگران بنادو"۔کیا حضرت یوسفؑ نے یہ مطالبہ اپنے مقصدِ بعثت اور فرضِ منصبی سے زاید کیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ ان کے مقاصد بعثت کی تکمیل کے لیے ایک تدبیر تھی۔اس لیے کہ دعوت وتبلیغ کچھ لوگوں کا تزکیہ نفس کرسکتی ہے کچھ لوگوں کو معاشرے کی سر براہ کاری کے لیے تیار کرسکتی ہے لیکن معاشرے کے سوادِ اعظم کے تربیت وتزکیہ کے لیے جو معاون ماحول درکار ہے وہ حکومت تسلط کے بغیر نہیں بن سکتا۔نتیجتاً دعوت وتزکیہ کے کچھ پھول تو اپنی بہار جانفزا

دکھلا جاتے ہیں لیکن ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جو بن کھلے ہی مرجھا جاتے ہیں، کیونکہ انہیں تربیت وتزکیہ کے لیے جس معاون ماحول کی ضرورت ہوتی ہے، حکومت تو اس کے خلاف ماحول اور فضا بنا رہی ہوتی ہے۔ صحیح بخاری کے مطابق بنی اسرائیل کے انبیاء سیاست کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ آتے ہی تمام اقوام مدینہ سے حاکمانہ اختیار کو منوایا۔ آخر اس عمل کا کوئی درجہ تو متعین کریں۔

۴۔ فاضل مضمون نگار نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکومت واقتدار کی ساری پیش کشوں کو ٹھکرا دیا، جب غلبہ واقتدار حاصل ہو رہا تھا تو کیوں ٹھکرایا؟ (ص ۲۳) غالباً ان کا اشارہ عتبہ بن ربیعہ کی پیش کش کی طرف ہے۔ صاحب مضمون کے بارے میں ہم یہ تو بدگمانی نہیں کرسکتے کہ وہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ اقتدار کی وہ پیش کش ہمیشہ اس بات سے مشروط تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ کلمہ توحید والی دعوت چھوڑ دیں۔ ہمارے بتوں کی کمزوریاں بیان کرنا چھوڑ دیں۔ اگر وہ قبول ایمان کے ساتھ یا بغیر شرط کے یہ پیش کش کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے قبول نہ کرتے تو پھر یقیناً صاحب مضمون کی بات میں وزن ہوتا۔

۵۔ یہ سوال بھی اٹھایا گیا ہے کہ قرآن نے یوسفؑ کے اقتدار تک پہنچنے کی تفصیل بیان کی ہے جس میں ان کی کسی انقلابی جدوجہد کا ذکر نہیں۔ غلامی، فتنہ خواتین کے باعث جیل قبول کرنا اور خوابوں کی تعبیر کے ذریعے بادشاہ تک رسائی، اس میں کون سی چیز انقلابی جدوجہد کہی جاسکتی ہے؟ (ص ۲۳) انقلابی جدوجہد سے مضمون نگار کی کیا مراد ہے، ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہ مضمون پڑھ کر یہ ضرور محسوس ہوا کہ اس ترکیب سے یا تو انہیں کچھ چڑ سی ہوگئی ہے یا وہ دوسروں کو چڑانا چاہتے ہیں۔ اگر تو ان کے نزدیک انقلابی جدوجہد سے مراد نعرہ بازی، جلوس، دھرنا، ہڑتال اور احتجاجی یا انتخابی سرگرمیاں ہیں تو یہ چیزیں تو یقیناً اس دور میں مرّوج ہی نہ تھیں لیکن اگر انقلابی جدوجہد سے مراد دعوت وتربیت اور اصلاح وتنظیم معاشرہ اور اس کے نتیجے میں حق وباطل کی کشمکش ہے تو اس کے لیے حضرت یوسفؑ کو جتنے وسائل اور مواقع میسر آئے، انہوں نے اختیار کیے۔ حضرت یوسفؑ عام غلاموں کی طرح عزیز مصر کے غلام نہیں تھے بلکہ اس کے تمام معاملات کے انتظام وانصرام میں معتمد تھے۔ زلیخا اور بیگمات مصر کے فتنے میں

سرخروئی کے باعث وقت کی اشرافیہ (Elite class) میں آپ کے کردار کا رعب اور دھاک بیٹھ چکی تھی۔ جیل میں بھی اپنی نیکی و پارسائی کے باعث قیدی عوام میں بنظر احترام دیکھا جانا قرآن میں مذکور رہے۔ شاہی ملازم قیدیوں کا کہنا: ﴿إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [یوسف ۱۲:۳۶] ”بے شک ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک بھلے انسان ہیں۔“ ثابت کرتا ہے آپ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے تھے پھر آپ اپنی دعوتی جدوجہد سے بھی غافل نہ تھے۔ آپ نے خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے انہیں اپنا اور اپنی فکر و دعوت کا پورا تعارف کرایا۔“

”بے شک میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں“ (یوسف ۱۲:۳۸-۳۷) ان کی دعوت ہر غور و فکر کرنے والے کو اپیل کرنے والی تھی: ﴿ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ [یوسف ۱۲:۳۹] ”سوچو کہ بہت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔“

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ وہاں اپنی دعوت سے غافل نہ تھے۔ مضمون نگار غلامی، جیل اور خوابوں کی تعبیر کے ذریعے بادشاہ تک رسائی کو مافوق الفطرت سا بنا کر پیش کرتے ہیں۔ کوئی بادشاہ محض خواب کی تعبیر بتانے والے کو یہ نہیں کہتا کہ ﴿اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ﴾ [یوسف ۱۲: ۵۴] ”آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر ہمیں بھروسہ ہے“۔ یہ کہنے سے پہلے بادشاہ حضرت یوسف کے کردار کی عظمت کو دیکھ چکا تھا کہ جب خواب کی دل لگتی تعبیر سننے کے بعد بادشاہ نے نہ صرف حضرت یوسفؑ کی رہائی کا حکم دیا بلکہ اپنے دربار میں بلا کر عزت افزائی کرنا چاہی تو انہوں نے رہا ہونے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پہلے ان کا مقدمہ دوبارہ کھولا جائے۔

پورے ملک میں اس خبر کو حیرت سے سنا گیا ہوگا کہ ایک قیدی ایسا بھی ہے جو رہائی پر قید کو اور شاہی اعزاز پر جیل کی مشقت کو ترجیح دے رہا ہے اور بادشاہ سے اس وقت تک ملنے کے

لیے تیار نہیں جب تک اس کی بریت کا اظہار نہ ہو جائے اور پھر زلیخا اور خواتین مصر جن کی وجہ سے جیل جانا قبول کیا تھا، انہوں نے خود یوسفؑ کی صفائی دے دی تو کتنے درباری امراء ہوں گے جن کے دل یوسفؑ کے کردار کی عظمت کے سامنے جھک گئے ہوں گے کوئی بادشاہ محض خواب کے تعبیر بتانے والے کو اختیاراتِ مملکت یونہی نہیں سونپ دیتا۔ بادشاہ نے بھی دیکھ لیا تھا کہ یہ محض معبرّ ہی نہیں، بحرانی حالات میں مسئلے کو حل کرنے کی تدبیر بھی جانتا ہے۔ قحط کے دنوں کے لیے غلّے کی حفاظت کی جو ٹیکنیکل تدبیر آپ نے بتائی، اس سے معاملات حکومت چلانے والے ایک بہترین ٹیکنو کرٹ کی صلاحیت کا بھی اظہار تھا۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن نے ایک چیز کو اختصار سے بیان کیا ہے تو وہ محض یہ نہیں ہے کہ محض خواب کی تعبیر کی وجہ سے آپؑ بادشاہ بن گئے۔ پھر صاحب مضمون نے آیت ﴿ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ [یوسف ۱۲: ۵۶] "اور اسی طرح ہم نے یوسف کو زمین میں حکمران بنایا" کا تو ذکر کیا ہے لیکن اس سے پہلے اس مطالبے کا ذکر گول کر گئے کہ آپ بادشاہ کی عقیدت مندی پر قناعت کر کے نہیں رہ گئے بلکہ لوہا گرم دیکھ کر آپ نے اس پر: ﴿ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ﴾ [یوسف ۱۲: ۵۵] کے مطالبے کی ضرب بھی لگا دی۔ متصوفانہ ذوق پر تو یہ مطالبہ شاید گراں گزرے لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے نبوی مشن کی تکمیل کے لیے اسے ضروری سمجھا ہوگا تو ہی آپؑ نے ایسا کیا۔ اب یہ کام ہمارے مفتیانِ کرام کا ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کے اس عمل کے وجوب وعدم وجوب، فرض کفایہ یا مستحب درجے کا تعین کریں۔ اور اس بارے میں استفتاء کی ذمہ داری ہمارے فاضل دوست کو قبول کرنا چاہیے۔

۶۔ صاحب مضمون کا یہ سوال اٹھانا سمجھ سے بالاتر ہے کہ سلیمانؑ نے اقتدار کے لیے کون سی جدوجہد کی تھی۔ ان کو جدوجہد کی ضرورت کس لیے پیش آتی، ان کے والد داؤدؑ بادشاہ اور نبی تھے اور وہ حضرت طالوتؑ کی بادشاہت میں جہادی کمانڈر کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے، اور طالوت کو سموئیل نبی نے بادشاہ مقرر کیا تھا گویا پشت در پشت یہاں منہاج النبوہ پر بادشاہت چل رہی تھی تو اس کے لیے حضرت سلیمانؑ کو الگ سے انقلابی جدوجہد کی ضرورت کیوں پیش آتی؟

۷۔ مضمون نگار کے مطابق حدود اللہ کا نفاذ مشروط ہے اس بات سے کہ غلبہ ہوگا تو

حدود اللہ نافذ کی جائیں گی۔ اس لیے جب شرط موجود نہیں اور مشروط کا وجود شرعاً لازم نہیں۔ اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ جیسے نماز کی فرضیت کے لیے بلوغ شرط ہے لیکن بلوغ کے حصول کے لیے جدوجہد کی کرنا فرض نہیں چونکہ صاحب مضمون کے نزدیک غلبہ کی جدوجہد کسی نوعیت کی مشروعیت ہی نہیں ہے تو نفاذ حدود کی فکرمندی سے امت کی جان چھوٹی۔ کیا اس طرح کا قیاس مقاصدِ شریعت سے کسی طرح بھی ہم آہنگ قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا یہ قیاس مع الفارق نہیں ہے؟ اصولِ فقہ کے مطابق جس چیز پر واجب کی ادائیگی موقوف ہو، اس کا حصول بھی واجب ہوجاتا ہے جیسے نماز کے لیے وضو شرط ہے تو وضو کے لیے پانی کا حصول بھی واجب ہوجائے گا۔ اب اگر مسلمانوں کا ایک معاشرہ حدود الٰہی کے نفاذ سے محروم ہے تو ان میں سے کون سا طریقہ اور اصول فقہ مقاصد شریعت کے قریب قرار پائے گا: ۱۔ چونکہ اسلامی حکومت نہیں، لہٰذا حدود الٰہی کے عدم نفاذ پر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور حکومت الٰہیہ کا قیام اتنا ضروری (از درجہ واجب، فرض کفایہ وغیرہ) بھی نہیں ہے۔ ۲۔ حدود الٰہی کی تنفیذ کے لیے جو ممکن ہو، وہ تدبیر اختیار کرنا۔ صاحبِ مضمون سے ہم حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ بھی دوسرے آپشن کے انکاری نہیں ہوں گے لیکن دوسرے آپشن کے بارے میں فکرمندی تبھی ہوگی ناجب اس کی اہمیت فرض، واجب، فرض کفایہ یا کم ازکم مستحب امر کی حیثیت سے اہل دین کے دل ودماغ میں ہو۔ صاحبِ مضمون سے ہمارا تقاضا ہے کہ اگر ان کے نزدیک انبیاء کی بعثت کا مقصد اقامت دین نہیں ہے تو حضرت یوسفؑ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تدابیر کیوں کیں اور یہ جو اللہ نے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ [الحدید ۵۷: ۲۵] "اور ہم نے نبیوں کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کیں تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں"۔ انبیاء پر نازل شدہ کتابوں کا مقصود اگر انسانوں میں قیام انصاف ہے تو کیا یہ قیامِ انصاف کسی اسلامی نظمِ حکومت کے بغیر ہوگا اور اگر اسلامی نظمِ حکومت کے ذریعے ہونا ہے تو اس نظمِ حکومت کے لیے جدوجہد مذموم ہے یا محمود؟ مسئلے کی تفہیم کے لیے ہم تسلیم کرلیتے ہیں کہ غلبہ واقتدار کا حصول نہ انبیاء کی بعثت کا مقصد ہے اور نہ اقامت دین امت کا فریضہ۔ لیکن اللہ کے نازل کردہ کلام کے مطابق فیصلے کرنا دین کا تقاضا ہے یا نہیں؟

(بقیہ صفحہ نمبر: ۷۸)

تفہیم اسلام

مولانا عبداللہ عمر

فلسفۂ غزالی اور ناقدین کی حقیقت

امام غزالیؒ پر انکارِ عقلیت اور یونانی علوم کے علی الاطلاق انکار کی عالم گیر تہمت

جدید دور میں غزالیؒ پر تنقید کرنا، تمسخرانہ انداز میں ان کے لتے لینا اور ان کے مقابلہ میں ابن رشد کو اسلامی تاریخ کا ایک روشن، مثالی اور قابل تقلید کردار بنا کر پیش کرنا الحاد و جدیدیت سے متاثرہ حلقوں کا ایک ''شعار'' بن چکا ہے۔

''غزالی اور ابن رشد کے قضیہ'' سے ناواقفیت اور ناآگاہی کا یہ عالم ہے کہ ابن رشد کے ان مریدوں کو غزالی تو در کجا، خود ابن رشد کے بارے میں بھی صحیح معلومات حاصل نہیں ہیں کہ اسلام اور نام نہاد عقلیت کی آویزش کے حوالہ سے ان کا مؤقف کیا ہے اور امام غزالیؒ نے ایسا کیا لکھا تھا جس کا جواب دینا ابن رشد کے پیش نظر رہا۔

امام غزالیؒ کے بارے میں بعض حلقوں کے اندر یہ مشہور رہا کہ امام غزالیؒ پوری عقلی روایت کے خلاف ہیں اور اسے دین سے متصادم سمجھتے ہیں جبکہ ابن رشد کی فکر توازن اور اعتدال پر مبنی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ ابن رشد سائنس اور اسلام کے درمیان ہم آہنگی کے قائل تھے جبکہ غزالیؒ سائنس کے مخالف اور منکر تھے اور گیارویں صدی عیسوی سے شروع ہونے والا مسلمانوں کا سائنسی اور فکری انحطاط غزالیؒ کی مخالفت کی وجہ سے شروع ہوا۔[1]

امام غزالیؒ کو اقلیت کی ساری روایت کا دشمن سمجھنا اور تمام یونانی علوم کا مخالف باور کرانا صرف اخباری قسم کے قلم کاروں کے ہاں ہی نہیں تحقیق وتدقیق کے دعویدار مستشرقین کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔[2]

---

[1] ''غزالی و ابن رشد کا قضیہ، الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ''

[2] شیخ یوسف القرضاوی صفحہ ۴۹

فلسفہ کے حوالہ سے امام غزالیؒ کے موقف کا خلاصہ

۱۔ امام یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان فلسفہ اور سائنس کے صرف کارآمد علوم کو اختیار کریں اور مذہب کے دائرہ سے ان کو الگ رکھتے ہوئے ان کی بنیاد پر اسلام کو بدلنے کی کوئی کوشش نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک حکمت وفلسفہ اور سائنس کے تمام اجزاء قابل اعتراض نہیں بلکہ صرف وہ حصہ جو اسلام کی تعلیمات سے صریحا متصادم ہے۔ امام غزالیؒ کے اپنے الفاظ ہیں:

هذا الفن ونظائره ينبغي أن يظهر فساد مذهبهم فيه دون ما عداه۔ [۱]

یعنی ''فن الٰہیات اور اس کی امثال ہی فلسفہ کا دراصل وہ دائرہ ہیں جہاں فلاسفہ کے مذہب کی تردید ہونی چاہیے، نہ کہ فلسفہ کے کسی اور شعبہ (ریاضی، طب، منطق وغیرہ) میں۔''

۲۔ اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ دیکھیں:

علومهم أربعة أقسام: الرياضيات والإلهيات والمنطقيات والطبيعيات، أما الرياضيات … فلا غرض لنا فى الاشتغال بإيراده، وأما الإلهيات فأكثر عقائدهم فيها على خلاف الحق والصواب نادر فيها، فيخالفون أهل الحق فيها بالاصطلاحات والإيرادات دون المعانى والمقاصد إذ غرضها تهذيب طرق الاستدلالات وأما الطبيعيات فالحق فيها مشوب بالباطل (مقاصد الفلاسفہ 10)

یعنی فلسفیوں کے نظریاتی علوم کے چار بنیادی شعبے ہیں: ایک تو ریاضی ہے جس کو موضوع بحث بنانا مطلوب نہیں۔ دوسرا الٰہیات ہے، اس میں ان کے اکثر عقائد راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں۔ تیسرا منطق ہے جس میں اہل حق کے ساتھ ان کا اختلاف صرف اصطلاح میں ہے، اصل مفاہیم میں نہیں۔ چوتھا طبیعیات ہے جس میں الٹی سیدھی، دونوں طرح کی باتیں پائی

[۱] تہافت الفلاسفہ صفحہ ۸۱

جاتی ہیں۔"(۱)

۳۔ تہافت الفلاسفہ کی فہرست پر ایک نظر ڈال کر بھی یہ بات بآسانی معلوم کی جاسکتی ہے کہ غزالی کی گفتگو کا محور یا تو الہیات کے ان مسائل کی نشان دہی ہے جو دین کی تعلیمات سے صریحاً متصادم ہیں، یا پھر وہ فلسفیوں کے اس زعم کو رد کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے الہیاتی مسائل ودلائل ریاضی کی طرح شک وشبہ سے پاک ہیں۔

بقیہ: حصولِ غلبہ واقتدار اور بعثتِ انبیاء کا مقصد

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴، ۴۵، ۴۷ کی روشنی میں صاحبِ مضمون بتائیں کہ واجب، مستحب یا فرض کفایہ کس درجے میں امت سے اس کا تقاضا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اس موضوع کو سہل پسندی کے ساتھ فاضل دوست نے نبٹانے کی کوشش کی ہے، یہ کام جاوید غامدی اور مولانا وحید الدین خان کریں تو اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا تحریک مجاہدین سے نسبت رکھنے والی ایک قابل قدر تعلیمی تحریک سے وابستگی رکھنے والے اہل علم کریں تو ہوتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے غلبہ دین کی جدوجہد سے وابستہ کسی نعرہ باز تنظیم یا نیم حکیم مقرر کی تقریر کے ردّعمل میں یہ باتیں لکھی ہیں یا متصوفانہ ذوق اور اپنی درویشانہ طبیعت کے غلبہ کے باعث حکومت وغلبہ سے جو ایک چڑ یا الرجی سی ہوجاتی ہے، اس کے زیر اثر یہ کچھ تحریر ہوا ہے، ورنہ اگر مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب فریضۂ اقامتِ دین اور مولانا عتیق احمد قاسمی ندوی کی کتاب ''فکر کی غلطی'' جو انہوں نے مولانا وحید الدین خان کے جواب میں لکھی ہے، پڑھ لیتے تو شاید یہ نتائج اخذ نہ کرتے!

---

(۱) غزالی اور ابن رشد کا قضیہ صفحہ ۵۲

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

اسلامی بینکاری: غیر سودی یا سودی اور استحصالی

از ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی، پبلشر: فضلی بکس، کراچی ۲۰۲۵ء

ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی عالمی شہرت یافتہ بینکر اور ماہر معاشیات ہیں۔ آپ نے ۲۰۰۲ء سے لے کر آج تک پاکستان میں رائج اسلامی بینکاری کی حقیقت عیاں کرنے کے لیے متعدد مقالے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ کتاب اس پورے کام کا نچوڑ پیش کرتی ہے اور دو اور دو چار کی طرح ثابت کرتی ہے کہ اسلامی بینکاری غیر سودی نہیں بلکہ سودی اور استحصالی ہے۔ اسلامی بینک کاری کا کاروبار سودی نقشِ پا پر چل رہا ہے اور اسلامی بینک سودی بینکوں سے بھی زیادہ استحصالی بن چکے ہیں۔

کتاب میں وہ المناک تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے ذریعے پاکستانی عدالتوں نے اس ضمن میں کیے گئے حکومتی فیصلوں کی تصدیق کرتے ہوئے ملک میں جاری سودی نظام کو مستحکم کیا اور اسلامی بینکاری کو اس کا ایک ذیلی حصہ بنایا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ علمائے کرام کے ایک حلقہ نے حکومت وقت کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اس گروہ کے سربراہ مفتی تقی عثمانی ہیں جنہوں نے نہ صرف متوازی نظام بینکاری اور اسلامی بینکوں کے سودی کاروبار کو جائز قرار دیا بلکہ اپنے دارالعلوم سے اسلامی بینکوں کو کارکنوں کی فوج ظفر موج فراہم کرتے رہے جو اس مذموم کاروبار کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کرتی رہی ہے۔

جب تک مخلصینِ دین کو منظم نہیں کیا جائے گا اور محلہ اور بازار کی سطح پر ایک غیر سودی معیشت برپا نہ کی جائے گی سودی عملداری کی تحدید نہ ہوگی اور امتناعِ سود اور سٹہ کی ایک موثر مزاحمتی تحریک برپا نہ کی جاسکے گی۔ اس تحریک کا بنیادی ہدف پاکستانی معیشت کو عالمی سودی اور سٹے کی مارکیٹوں کی پیوستگی سے نجات دلانا ہوگا۔

تفصیل اس اجمال کی یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن اس کا ایک خاکہ ہماری کتاب ''اسلامی بینکاری کا متبادل'' جو جناب یونس قادری کی تحریر کردہ ہے، میں دیکھی جاسکتی ہے۔

we must work on the principle that our national security is currently at odds with our own liberal values, and we face the great challenge of Islamic currents emerging from all corners of the world—a kind of water vapor that has suddenly come from the sun and spread into our skies. ”

He reminded, “We must not test the truthfulness of Islamic values, for it will only lead more of us to Islam and the teachings of Muhammad. But we also need to give some space for Christianity, but remain in control not to shake the achievements of Western civilization, merely to curb the expansion of Islam."

Even his tragic conclusion echoes: “We are now at a scary crossroads—continuing liberal values means opening the door to a stream of Islamization, while returning to church will destroy the very foundations of liberalism that we are proud of.” Our younger generation no longer even believe in Jesus, and it's impossible to go back to church after a storm of boundless openness hits Europe."

And with a tone of fear he added, “I am concerned, if all these strategies fail, then the only option left is to encourage the creation of a great war—which restricts civil liberty, destroys public order, and creates an endless conflict in Muslim countries. The goal is only one: to remove Islam from the peaceful climate that has become the fertile ground for its spread. Because otherwise, then mosques and azan towers will fill Europe, and Islamists will gain majority votes in elections, dominate parliament, influence public opinion, economy, and ultimately—rule Europe with Islamic teachings.”

(Quoted from The Sun, UK)

face the current of Islamization and the idea of Islam through various means. Because otherwise, the only other option left is to recognize that Islam is the true religion of God—a religion that Jesus and other prophets also followed. This confession will surely divert us to accept Islam as our religion, for the sake of attaining the kingdom of God in this world and the hereafter. And that means, we are going back to the starting point of the battle between religion and state in Christian thinking—which clearly has a fundamental difference with Islam in the matter. ”

Therefore, he said, “We must stand against Islam, even if it means sacrificing the liberal values we have been proud of all this time. We need to establish laws that force Muslims to leave Europe—as Sweden did by extreme legalizing homosexuality and atheism. This drives Muslims to deviate or dissolve in our civilization, and ultimately lose their faith. We must also stop the flow of migration from Islamic countries to Europe and America, and open doors to non-Muslim migrants. Even if necessary, cooperate with Islamic countries to restrict the displacement of its people to our territory. "

“On the other hand,” he continued, “we must continue to support Israel, no matter how harsh their actions are, because we must not allow the formation of an Islamic system of government in Gaza that can serve as an example for the rise of Islamic politics in other Muslim countries. In this regard, we could benefit from the overwhelming support of Arab countries for Israel—as they themselves fear the emergence of an Islamic system of government or a democracy based on the teachings of Muhammad and the Qur’an. "

“For us, it doesn’t matter whether what we are doing is wrong, illegal, or immoral. It's none of our business. Clearly,

Confessions of British Premier

Europe Unfolds its hate for Islam and its Prophet

A shocking confession has flown in from Sir Keir Starmer, UK's current Prime Minister and former Labour MP. His statement contains honest signals about the reality of the issue between the West and the Islamic World. He stated, "Our main problem is not actually with Muslim nations, nor with their ruling regimes—because those rulers are actually revolving in the orbit of our interests. They continue to exist because of our protection and carry out policies that secure our national interests, though often contrary to their own nation."

Then, where is the real problem of the West in relation to the Islamic World?

According to Starmer, "Our real problem is with Islam itself and Muhammad, the Prophet of the Muslims. Because Islam is a religion of civilization that provides deep and detailed answers to all existential questions and civilization. Islam is a tough rival for Western civilization that is now losing it's momentum and light. Meanwhile, Islam and Muhammad are just shining—even amid European society itself, which has been given freedom of thought by liberalism values, and has weakened church power. This freedom of thought has led many intellectuals and young generations of Europe to embrace Islam, for in it they find all the answers to inner thirst, existential crisis, and spiritual emptiness caused by our contradictory civilization. "

Therefore, continued Starmer, "We have no choice but to